رقصِ حیات

پرویز شاہدی

مکتبۂ شاہراہ، دہلی

اپریل ۱۹۵۷ء

تعدادِ اشاعت :- ایک ہزار

قیمت :- تین روپے پچاس نئے پیسے

جید برقی پریس، بلّی ماران دہلی

فہرس

(۲)

اشارات

اپنے کرم فرما جناب پرویز شاہدی کے مجموعۂ اشعار کو ارباب ذوق سے متعارف کرانے کی گستاخانہ جراءت کر رہا ہوں۔ "گستاخانہ" اس لئے کہ شعر کوئی میرا فن نہیں اور اس بنا پر ائمہ فن کی نظر میں میری ایسی جراءت ناقابل معافی گستاخی ہے! حضرت جوشؔ کے ایک مجموعہ کلام کا تعارف کراتے ہوئے ایسی گستاخی پہلے بھی ایک مرتبہ کر چکا ہوں اور دوبارہ اسی حرکت کا مرتکب ہونا معذرت کے امکان کو بھی ختم کر دیتا ہے۔

میں بہرحال یہ درخواست تو کر ہی سکتا ہوں کہ ان سطروں کو تنقید و تبصرہ سمجھ کر نہ پڑھئے، کیونکہ آرٹ کا عصری فن نقد جس روش پر چل رہا ہے۔ مجھے اس کی فہم بھی نہیں ہے۔ اور یہ اعتراف کر لینے میں باک بھی نہیں۔

وسعت زبان و بیان کے سلسلے میں ہمیشہ اختراع و ابداع کا موئد ہوں، لیکن طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ "ادبی غرلیشیت" سے معاملہ نہیں کر سکتا۔ لوگ اپنی کم مائگی پر اجتہاد۔ ابداع کا پردہ ڈالیں۔ سنگ سخت کی مثال ہے۔

"احساس شاعر" کو آج کل کے نقاد "تجربہ" لکھ رہے ہیں! میری نظر میں کچھ ایسی ہی سی بات ہے۔ باور نہیں آتا کہ محض اُردو لکھا پڑھا آدمی لفظ "تجربہ" سے شاعر کا احساس مراد لے گا۔ یا پڑھا لکھا آدمی "احساس شاعر" سے شاعر کا تجربہ مُراد نہ لے گا۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ دوسروں کی تخلیقات ادب کا جائزہ لینے والے اپنی ادبی خامیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور انہیں مخصوص شعر کی بحث میں لفظ تجربہ کی بوست محسوس ہو!

جیسا اوپر عرض کیا، ان سطروں کا مقصد تنقید و تبصرہ کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ میں اپنے اندر اس کام کی اہلیت نہیں پاتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ فن شعر پر اُردو میں اتنا کچھ لکھا جا چکا اور لکھا جا رہا ہے۔ کہ میری کوئی ایسی کوشش اس ذخیرے میں نامعقول اضافے کا درجہ بھی نہ پا سکے گی۔ اس لئے میری کوشش اپنے تاثرات کے اظہار تک محدود ہوگی جو پرویز صاحب کا کلام سننے یا پڑھنے سے مرتب ہوئے۔ اور وہ بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کہہ سکوں گا جو فنی ٹیکنک اور اصطلاحات سے قطعاً عاری ہوگی۔

سب سے پہلے پرویز صاحب کے سوانح حیات سے متعلق چند اشارے کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

وہ ۱۹۱۸ء میں پٹنہ کے ایک خاندان سادات میں پیدا ہوئے اور سید محمد

اکرام حسین نام رکھا گیا (یہ نام اب مردم شماری کے رجسٹر سے باہر کوئی نہیں جانتا)۔ گھر کا ماحول کٹّر قسم کا مذہبی اور متصوفانہ تھا۔ جس کے معنی ہوتے ہیں کہ روایات پرستی مذہب کی جگہ لے لے۔ چنانچہ ان کو پرانے طرز کی فارسی، عربی کی تعلیم دی گئی۔ اور خود ان کے بقول پرویز صاحب مولوی اکرام حسین بن جانے سے بال بال بچ گئے۔ دس سال کی عمر میں کسی بزرگ سے بیعت بھی کر لی اور اذکار وظائف بھی گردانے لگے۔

شعر گوئی کا چسکا آٹھ سال کی عمر سے ہی پڑ گیا تھا۔ اور دس سال کی عمر میں مشاعروں میں شریک ہونے لگے تھے۔ ابتدا میں چند غزلیں مولانا عین الہدیٰ صاحب ثمر آروی کو دکھائی تھیں۔ سنہ ۲۵ء میں میٹرک پاس کیا اور سنہ ۲۹ء میں بی۔ اے (آنرز) کرنے کے بعد دو سال قانون پڑھا۔ پھر سنہ ۳۴ء میں اردو ایم۔ اے اور سنہ ۳۵ء میں فارسی ایم۔ اے کر لیا۔ انہیں دنوں ایک جذباتی صدمے سے دوچار ہوئے اور ترکِ وطن کر کے کلکتہ چلے آئے۔ کلکتہ میں درس و تدریس کا مشغلہ رہا۔ پھر سنہ ۳۸ء میں بی۔ ٹی پاس کر کے اسکولوں کی انسپکٹری، ہیڈ ماسٹری اور کالج کی پروفیسری میں وقت گذرتا رہا۔ یہاں تک کہ سنہ ۴۹ء میں نظر بند ہو کر جیلوں کی ہوا کھائی۔ پروفیسری انتظار نہ کر سکتی تھی۔ اب بہرحال ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔

۱۹۲۶ء تک یعنی میٹرک کرنے کے ایک سال بعد تک ناسخ و آتش، میر و سودا اور
داغ و غالب کے دیوانوں کا مطالعہ کر چکے تھے۔ اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تلمذ کی بدعت
بندی کی انفرادیت کو نکھرنے سے روکتی ہے، چنانچہ اپنے شعر میں ابتداً ناسخ کی پیروی
کی۔ پھر غالب کا اثر غالب آ گیا۔ مگر چونکہ فطرت میں بغاوت کا عنصر ہے۔ تمام ادبی
مسلّمات سے انحراف کر کے شعر کہنے کی کوشش کرتے رہے۔

۱۹۳۳ء میں ایک فکری انقلاب سے دو چار ہوئے اور جہل و واہمہ پرستی کے
عقائد سے جارحانہ شکل کی بیزاری ہو گئی۔ خود ان کے بقول اس وقت تک انہیں
شعور میں بیداری آنے کا کوئی محرّک نہیں ملا تھا۔ یہاں تک کہ مارکسی ادب اور فلسفے کے
مطالعہ سے منکشف ہوا کہ ان کی باغیانہ فطرت خود ان کی جدّتِ طبع کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ
سرمایہ دارانہ نظام کا ہی انعکاس تھا۔ اور یہ سمجھ کر سمجھ میں آیا کہ "بغاوت برائے بغاوت"
کے انتشار آمیز طریقے جہل و حمق ہی کی صورتیں ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں نظریاتی اشتراکیت
کے حجرے سے نکل کر عملی اشتراکیت کے وسیع میدان میں پہنچے تو خود ان کے بقول کروڑوں
ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھے اور کروڑوں آنکھیں روشنی بخشنے لگیں۔ اس طرح
بے خود صاحب کا قوم پرستانہ سیاسی عقیدہ مارکسزم کے مطالعے سے اشتراکیت میں

بدل گیا۔ خود ان کے الفاظ میں سنیئے :۔

"اب میری شاعری فلسفیانہ اور عاشقانہ شعبدہ بازیوں کی حد سے آگے بڑھ گئی اور اس کا رنگ سخت جانی انفرادی رومانیت کے باوجود سماجی اور سیاسی ہو گیا۔ مطالعے کی وسعت، تجربوں کا تنوع، سماجی تضادات کی شعبدہ بازیاں، مقتدر طبقے کی بے نقاب سازشیں وہ چیزیں تھیں جنہوں نے میرے شعور کا رنگ بدلا اور اب شعر و ادب خود پسندانہ سٹّہ بازی نہیں۔ بلکہ اجتماعی شعور کا نقش نظر آتے ہیں۔"

پرویز صاحب کی شاعری کا یہ ارتقا اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ ان کی ترقی پسندی ایک فطری چیز ہے کسی نظریئے کو قبول کر کے اسے اپنے شعر پر مسلّط نہیں کیا ہے۔ موہوبت کی حد کو چھو کر توہم پرستی تک اور وہاں سے بہ مدارج مارکسی فلسفے تک پہنچنا ان کی فطری تلاش و جستجو کا نتیجہ ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ وہ فیشن کے ترقی پسند نہیں بلکہ فی الواقع ایسے ہیں۔ تیس سال شاعری کرنے کے بعد کہتے ہیں :۔

کچھ دھوپ اور پڑنے دو افکارِ تازہ کی
ناپختہ ہیں نہالِ سخن کے ثمر ابھی،

مجھے جتنا پرویز صاحب کے شعر نے متاثر کیا، اس سے زیادہ ان کی شخصیت نے متاثر کیا:

مجھے وہ بالکل فطری انسان نظر آئے۔ سادہ فطرت کے آدمی جیسے انھیں تصنع اور تمدن کی ہوا نہ لگی ہو۔ وہ جیسے ہیں ویسے ہی نظر بھی آتے ہیں۔ اور یہ بات ان سے کوسوں دور معلوم ہوتی ہے کہ وہ جیسے ہیں اس سے مختلف نظر آنے کی کوشش کریں۔ اس عہد میں سادہ فطرتی ایک گونہ کمیاب شے ہے۔ قیاس کہتا ہے۔ کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں ابتدائی متصوفانہ تربیت اور آخر میں اشتراکیت دونوں کا ہاتھ ہے۔ اس اعتبار سے میں انھیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ صوفیت اور اشتراکیت کے صحت مند عنصر ان کی شخصیت کی تعمیر میں کام آئے۔ بہ صورت دیگر وہ ایک بر خود غلط مولوی، صوفی بھی بن سکتے تھے۔ یا ایک گمراہ اشتراکی بھی۔ تصوف میں تعلیم اگر صحیح ملے تو آدمی کی انا ختم ہو جاتی ہے۔ اور اشتراکیت کے تو معنی ہی اجتماعیت کے ہیں۔ غالباً یہی دو باتیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئیں۔ لیکن اب اس کی جستجو بھی کیوں ہو؟ جو کچھ بننا تھا، بن گئے۔

تکمیلِ فن کے باب میں دانایانِ راز نے فن کار کے خلوصِ مقصد کو اہم عنصر قرار دیا ہے۔ پرویز صاحب کے کلام اور شخصیت میں بھی خصوصیت سب سے زیادہ متاثر کرنے والی ہے: اور میرے خیال میں ان کی سادہ فطرتی کا پرتو ہے۔ کلام نثری بھی شعری کلام اگر خلوص پر مبنی نہیں تو وہ احساس قاری یا سامع تک ایصال بھی نہ ہو سکے گا۔ اور اس لئے شاعر اپنے مقصد اولیٰ

میں ناکام رہیگا۔ ایصالِ احساس کو اردو زبان میں نا ثیر کلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میرے اندازے میں پرویز صاحب کی شاعری اس خصوص میں نہایت کامیاب ہے۔

بحیثیت مجموعی پرویز صاحب کی شاعری روایتی حقیقت نگاری کہی جا سکتی ہے۔ فلسفۂ اشتراک کا نظریہ کہ انسان کا شعور اس کے مادی ماحول کے اندر ہی ابھر پاتا ہے حقیقت نگاری کی بنیاد بنا؟ اور اس کو انیسویں صدی کے یورپ کی حقیقت نگاری سے ممیز کرنے کے لئے اس پر "اشتراکی" کی صفت ایزاد کی گئی۔ اور اسی کے تحت فنی ہیئت و پیکر کے قومی ہونے اور جوہر کے اشتراکی ہونے کا اصول وضع ہوا۔ یہ میرا اپنا خیال ہے کہ قومی پیکر کے اندر فن میں خصوص پیدا ہو جانے کے لئے زیادہ کاوش لازمی نہیں ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی پرویز صاحب کی شاعری بہت ممتاز ہے۔ نئے شعراء میں گنتی کے چند شاعر قومی پیکر کے اصول کو کامیابی کے ساتھ نباہ سکے! اکثریت ایسے شعراء کی ہے جو یا تو اس اصول کو حسنِ کارانہ طریق پہ نباہ نہ سکے یا سرے سے قومی پیکر یعنی بحر و قوافی کو مردود قرار دے بیٹھے۔

یہ حقیقت میری نظر میں ہے کہ مکتب و مدرسہ کا طریق تعلیم ختم ہو گیا۔ اور اسکول کالج کے تعلیم یافتہ قومی پیکر کے اصول کو فن کارانہ طریق سے استعمال کرنے پر قادر نہیں۔ لیکن دریا نہیں کار بند ساقی! ایسے شعراء کو حصولِ علم سے مانع کون سی بات ہے!

پرویز صاحب اس وقت میدان شعر میں آئے جب مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں آزادئ وطن کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اور گاندھی جی کی آواز نے غلام ہندوستان کو گہری نیند سے چونکا دیا تھا۔ اس وقت ملک، خاص کر ملک کے نوجوان طبقے میں وطنیت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس جد و جہد میں قوم پرستانہ شاعری شروع ہوئی۔ اور پرویز صاحب نے بھی تحریک سے گہرا اثر لیا۔ ان کی اس وقت کی شاعری میں سرفروشانہ حب وطن کے جذبات ابھرنے لگے۔ اس وقت ہر ہندوستانی کے دل و دماغ میں جو جذبات و محسوسات جوش مار رہے اور ارض وطن سے خوشبو کی طرح پھوٹ رہے تھے۔ پرویز صاحب کے شعروں میں ڈھلنے لگے۔

میرے خیال کے مطابق وہ موقع پرویز صاحب کی شاعری کے لئے نقطۂ انحراف کی صورت رکھتا ہے۔ اس وقت اگر وہ قومی تحریک سے متاثر نہ ہوتے تو کولھو کے بیل قسم کے شاعر بن کر رہ جاتے۔ یہاں بھی ان کی ترقی پسندانہ فطرت کام کرتی نظر آتی ہے جس نے بالآخر انہیں مارکسی فلسفے تک پہنچا دیا۔ ان کی اُس وقت کی نظموں میں تلوار، بنت ہمالہ وغیرہ اردو زبان کے قوم پرستانہ ادب کا سرمایہ سمجھی جائیں گی۔

تلوار :— ہند ہے جس کی عظمت رفتہ سارے جہاں کو یاد

صدیوں کی محکومی سے ہے آج غلام آباد
ہمّت ہارے پاؤں پسارے قوم کے ہیں افراد
گرد غلامی سے چہروں کی رونق ہے برباد

دھو دے اپنے پانی سے دھو دے چہروں کی پھٹکار

اے پیاری تلوار!
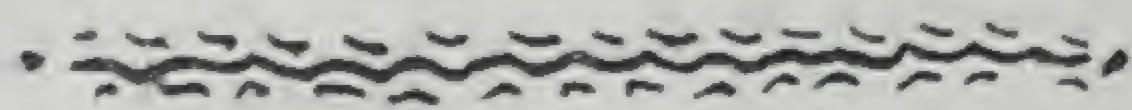
بنتِ ہمالہ

آہ اے کوہ ہمالہ کے عزیز سیّال!
تیری موجوں میں جمال اور تیرے طوفاں میں جلال
تیرے دامن پہ کبھی بیٹھی نہ تھی گردِ ملال
منہ ترا پونچھتا تھا چاند کا سیمیں رومال

زخم سینوں پہ لئے آج ہیں دھارے تیرے
اف کہاں ڈوب گئے چاند ستارے تیرے!

تقسیم ہند کے بعد کی بعض نظموں کے اقتباسات بھی ملاحظہ کیجئے جن سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ پرویز صاحب کا احساس کس قدر گہرا ہے۔

دعوت :- میں اپنے ہونٹوں پہ شعلے بچھا کے جاؤں گا
ہر ایک سانس میں بجلی چھپا کے جاؤں گا
نظر کو شعلۂ سرکش بنا کے جاؤں گا
ضرور جاؤں گا اور سر اٹھا کے جاؤں گا

دیار دار و رسن نے مجھے بلایا ہے

جوانی ہمارے وطن میں :-

قلم آج تلوار بننے کو بے تاب ہے دفتروں میں
شمار اب تو سانسوں کا ہونے لگا ہے یہاں خنجروں میں
پھینکے جا رہے ہیں جوانی کے غصّے سے چہرے لکھے ٹھوکروں میں
بجھا دینا شعلوں کا آساں نہیں ہے ہمارے وطن میں

رجز انقلاب :- میں ہی دیرینہ تمنّا ہوں دل ایّام کی
میرے آئینے میں ہے تصویر صبح و شام کی
ہر نفس میں ہے اجالا، ہر نظر میں روشنی
میں تڑپتی آرزو ہوں سینۂ تاریخ کی

اس حقیقت کو دہرانا اب شاید ضروری نہیں رہ گیا ہے کہ کائنات عالم انقلاب پر مبنی ہونے کے باوجود بیسویں صدی کے نصف اوّل میں اس دُنیا نے بڑے سنگین انقلاب دیکھے جنہوں نے دُنیا بھر کے انسانی سماجوں کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اِس کے مقابلے میں انیسویں صدی پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس وقت کے انسانی سماج بند پانی کی طرح ٹھہرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور بدلو آتی محسوس ہوتی ہے۔ اِن عظیم انقلابوں نے انسانی ذہنی فکر کو زبردست ہمیز دی اور عندیات و تصوّرات کی وہ ریل پیل ہوئی کہ ان کا احصار دشوار ہو گیا سوویت مصنّف الیکزی طالستائی نے اِس حقیقت کو بڑے دِلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

"......... وہ روسی جو سوچنا جانتا ہی نہ تھا، اِس دوسری جنگ عظیم میں مفکّر بن گیا! ایک گولے کے بعد دوسرا گولا پھٹنے کی مہلت میں مشکل سے مشکل صورت حال کا حل نکالنے کے قابل بن گیا........."

ہم دیکھ رہے ہیں کہ رسل و رسائل کی سرعت رفتار نے دُنیا کی طنابیں کھینچ دی ہیں، اور اب سے کچھ پہلے جو علاقے نہایت دور افتادہ کہے جاتے تھے۔ وہاں بھی نئے افکار کے بیج جا بوئے ہیں۔ ہندوستان نسبتاً گئر پنتھی ملک تھا۔ گر خیالات و تفکّر کی

یہاں بھی وہی فراوانی ہے جو کہیں اور ہو سکتی ہے۔ ہندوستانی زبانوں کے شعر و ادب میں ہجوم افکار کا ہی زور رہا ہے۔ چنانچہ میرے سن و سال والے جن کا ذہن و فکر مقید نہیں ہے اپنے عقائد و تصورات میں بار بار ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ورنہ زندگی کے سانچے میں فٹ نہیں ہو سکتے!

اردو زبان میں غزل ایک ایسی صنف کلام تھی جو الگ گنے موضوعات کے علاوہ کسی خیال و تصور کو اپنے اندر جگہ نہ دیتی تھی، مگر فراوانیٔ افکار نے اسے وہ حدیں توڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس موضوع پر کسی تفصیلی گفتگو کا تو یہ موقع نہیں، صرف توجہ اس طرف مبذول کرانا مقصود تھا۔ کہ ایسی کٹر ہٹیلی صنف کلام بھی طغیان افکار سے شرابور ہو گئی!

میر نیر صاحب کے کلام میں یہ فراوانیٔ افکار بہت سوں سے بہت زیادہ نظر آئی ہے۔ ان کی غزل کے لئے کوئی موضوع غیر مناسب نہیں۔ موضوع کی خشکی و کرختگی ان کے جمالیاتی اظہار و بیان میں کھو جاتی ہے۔ میرے لئے ان کی نظم اور غزل میں امتیاز دشوار ہے، اور زبان ان سے تنگ دامانی کا عذر کرتی نظر آتی ہے۔ غزلوں کے بعض شعر یہ ہیں:-

زمیں مرکزِ سطوتِ زندگی تھی ، اسے آفتِ شہریاری نے مارا

ہے تابناک تیرگیِ سیم و زر ابھی آیا نہیں ہے وقتِ طلوعِ ہنر ابھی

احباب تباہی پہ میری مغموم نہ ہوں ماتم نہ کریں

یہ گردشِ دوراں میری ہے، وہ فتنۂ دوراں میرا ہے

بنی ہے اضطرابِ شوق وحشت گن قلبِ آہن کی

اُگے ہیں کشتِ دہقاں سے رُخ و کاکل کے افسانے

تم تو کرتے ہو مری کلکِ سخن کو پابند کون ہے کاتبِ تقدیرِ وطن، کیا جانو؟

جانا کوئی ضرور نہیں ماورائے ارض آخر یہیں کہیں تو ہے کاشانہ آپ کا

تیغِ خوں ریز کے دیکھے ہیں لگائے ہوئے باغ کیوں دکھاتے ہیں نیا خوابِ گلستاں ہم کو

یہ تاج کے سلائے ہیں زر و سیم کے خرمن کیوں آتشِ کشکولِ گدا سے نہیں ڈرتے؟

پامال گردنوں کی بلندی کے واسطے

خوش ہو رہا ہوں رکھ کے ہتھیلی پہ سر کو میں

موت کی تجارت کو زندگی نہیں کہتے آدمی کے دشمن کو آدمی نہیں کہتے

گیت ہریالی کے گائیں گے سسکتے ہوئے کھیت محنت اب غارتِ جاگیر تک آ پہنچی ہے

مثالوں سے ان سطروں کو بوجھل بنانا مقصود نہیں، لیکن ان چند شعروں کے موضوع غیر شاعرانہ ہی نہیں، بالکل غیر متغزلانہ ہیں۔ جمالیاتی اظہار و بیان، مخلصانہ لہجہ، شستگیٔ زبان، صحت الفاظ اور لفظوں کے در و بست کا اگر فن شعر میں کوئی درجہ ہے تو میرے خیال میں پرویز صاحب نے غزل میں سب ہی موضوع داخل کرنے کے ابداع کو حُسن بنا دیا ہے!

ان کے شعر کی ایک اور نمایاں خصوصیت اس کا جمالیاتی پہلو ہے۔ نئے ادب کی تحریک کے جلو میں قدیم روایاتِ شعری کے ساتھ رومانیت اور جمالیاتِ ادب بھی مردود ٹھیرے، حالاں کہ اشتراکی حقیقت نگاری نہ علویت سے خائف ہے نہ رومانیت سے متنفر، وہ جس چیز سے بیزار ہے۔ وہ تنگ خیالی و تعصب ہے۔ متعصبانہ ذہنی انداز شاعر کے انقلابی جوش میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اور ایسا شاعر نہ تو سطح سے نیچے اتر سکتا ہے نہ فضا سے بالاتر جا سکتا ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری فن کار سے صرف ایک مطالبہ کرتی ہے۔ وہ صداقتِ حیات کو فن کارانہ اسلوب میں پیش کر سکے!

صداقتِ حیات نہ صرف انسانی سماجوں کے اندر بلکہ کائنات میں جاری و ساری ہے؛ اس لیے وہ خارجی شے ہے۔ جمالیاتِ ادب کا تقاضہ ہے کہ سماجی شعور کے دوسرے

چیکوں کی طرح شعر و ادب بھی خارجی حقیقت کو پیش کرے۔

اس اعتبار سے پرویز صاحب کی شاعری بہت زیادہ معقول ہے اور میرے اندازے میں خارجی حقیقتوں کو تغزلانہ رنگ دینے میں مشکل سے کوئی ان کا حریف ہو سکتا ہے۔

یوں تو عصری شاعری میں رجائی انداز فکر عام ہے لیکن بیشتر شعراء کے یہاں یہ چیز لغو بازی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے بالکل برخلاف پرویز صاحب کے شعر میں زندگی سے محبت فکری چیز ہے اور سنجیدہ روپ میں سامنے آتی ہے۔

اس موقع پر یہ یاد دلانا شاید بے محل نہ ہو کہ سرمایہ داری کے تضاد نے انسان کی زندگی کو یاس کی اس حد سے جا ملایا تھا۔ جہاں انسان کو خودکشی میں پناہ لینا پڑتی ہے۔ سرمایہ داری ادب نے ایسے بہت سے کردار تخلیق کئے۔ جنہوں نے اپنی جان خود لے کر زندگی کی گتھیاں سلجھائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے سائنس کی ترقی کو جب اپنے سونے چاندی کے پہاڑوں کے خلاف ہوتے دیکھا۔ تو اسے قید و بند میں ڈال دیا۔ اور وہ دست و پا بستہ سائنس رجعت پسندانہ حل پیش کرنے لگا۔ دنیا کی بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کی غذا کا مسئلہ انسانوں کی فنا میں حل کیا۔ اور اس لئے جنگیں اور وبائیں ناگزیر ٹھہرائیں۔

سرمایہ دارانہ علم وفن کی یہ معذوری و بے چارگی اشتراکی ادب و سائنس کے وجود میں آنے سے رفع ہوئی ، کیوں کہ اشتراکی نظام نے ثابت کردیا کہ وہ سارے انسانوں کے معاشی مسائل حل کرسکتا ہے۔ اور خودکشی کرلے یا آبادی کو گھٹانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

آج یہ بہت صاف ہو کر نظر آنے لگا ہے ۔ کہ دنیا کا مستقبل سوشلزم میں ہے : انسان کی معاشی نجات کا یہی ایک ذریعہ ہے ۔ لیکن میرے خیال میں پوری دنیا میں اشتراکیت قائم ہوجانے کے بعد بھی نوع انسان انقلاب روس کا احسان فراموش نہ کرسکے گی ۔ جس نے پہلی بار سوشلزم کا امتحان پاس کیا۔

چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا بھر کا شعروادب یاس پرستی کی بیڑیاں کاٹ رہا ہے اور ابن آدم "بجنس یا ہمیر" یعنی "کریا مر" کا نعرہ لگا رہا ہے۔ انسان امیدوں اور حوصلوں سے معمور ہوگیا ہے۔ ان حوصلہ مندیوں کی گونج پرویز صاحب کے شعر میں متواتر اور شدت سے سنی جاتی ہے۔ انہوں نے مایوسی اور بیزاری کا مفہوم بدل کر رکھدیا ہے۔

موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگادی مجھے مرنے نہ دیا

اِن کے شعروں میں غمِ دوراں "کیف آفریں" اور غمِ جاناں "شکفتہ انگیز" ہو جاتا ہے۔ ہجر و رقابت رکیک جذبے ہیں۔ اور انسانیت کی تذلیل، اس لئے پرویز صاحب کا جذبۂ خود اعتمادی ان کے ذکر و خیال کو بھی پاس نہیں کھٹکنے دیتا۔ واضح لفظوں میں یوں سمجھیے کہ یہ چیزیں شاعر کا احساس نہیں بن پائی ہیں۔

اِس مجموعے کے دو حصّے ہیں، دوسرے حصّے میں سنہ ۔۔۔ تک کا کلام شامل ہے۔ میں نے حصّۂ اوّل ہی پر نظر رکھی ہے۔ اور ان کے سیاسی معتقدات سے گفتگو کرنا میرے مقصد سے باہر تھا بعض نظمیں سیاسی اور ہنگامی ہیں۔ جیسے "وارگا" یا "یانگسی" یا "اسٹالن" وغیرہ مگر ان ہنگامی نظموں میں "ضیافت" یا "روشنی کو ووٹ دو" ہنگامی ہونے کے باوجود اعلیٰ ادبی قدریں رکھتی ہیں۔ ان کی نظم "شیروانی" اپنے نفسیاتی اور جمالیاتی محاسن کے اعتبار سے الگ ایک مضمون کی متقاضی ہے۔

اوپر کی سطروں میں میں نے پرویز صاحب کے کلام کے مخصوص پہلوؤں پر عمومی اشارے کئے ہیں۔ آخر کلام پر ان کی ایک چھوٹی سی نظم "سازِ مستقبل" پر جو مجموعہ کی پہلی نظم ہے، ذرا تفصیلی نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

"سازِ مستقبل"، وہی رجائی ترانہ ہے جس پر میرے خیال کے مطابق پرویز صاحب

کی شاعری کھڑی ہے۔ شاعر کا احساس با شعور مستقبل کو اپنی آرزوؤں کے مطابق درخشاں دیکھتا ہے۔ تو پوچھ بیٹھتا ہے۔

کس نے چھیڑا ہے سازِ مستقبل؟ آج لمحات گنگناتے ہیں!

میرے خیال میں اس نظم کا یہ موضوعی شعر ہے۔ اور موضوع کو اُجاگر کرنے کے لئے شاعر نے پانچ شعر کا اضافہ کر کے اس موضوعی شعر کو آخر میں جگہ دی ہے۔ مستقبل جیسا کہ دوسرے لفظوں میں انسانی مستقبل جو آنے والی نسلوں کی جاگیر ہوتا ہے اس حقیقت کو شاعر نے صناعانہ کمال کے ساتھ حسین و دل نشیں استعاروں میں بیان کیا ہے! آنیوالی انسانی نسلوں کو یا ان کی خوش بختی کو ناتراشیدہ اصنام کی کسمساہٹ، ناشگفتہ پھولوں کی گدگداہٹ، نادیدہ جلوؤں کی مسکراہٹ سے استعارہ کرنا شعریت و فن کاری کا عروج ہے!

ظاہر ہے کہ شاعری اگر رمز و کنایہ پر مبنی نہیں تو اس سے نثر بہتر ہے۔ شاعری فن کا درجہ اسی صورت میں حاصل کرتی ہے۔ جب مفہوم استعاروں کی صورت میں ادا کیا جائے۔ اور اس تکنیک شعری میں پرویز صاحب کو پوری دسترس حاصل ہے۔ اب وہ نظم سنئے۔

کتنے اصنام ناتراشیدہ — پتھروں ہی میں کسمساتے ہیں

کتنے ہی ناشگفتہ لالہ و گل — ذہن بلبل کو گدگداتے ہیں

کتنے ہی جلوہ ہائے نادیدہ — ابھی پردے میں مسکراتے ہیں

ناسرائیدہ کتنے ہی نغمے — دل کے تاروں سے لپٹے جاتے ہیں

بے جلائے ہوئے دیے کتنے — رات ہونے ہی جھلملاتے ہیں

کس نے چھیڑا ہے سازِ مستقبل

آج لمحات گنگناتے ہیں،

جب آپ ان کی نظم "بربطِ دل" کو پڑھیں گے تو گویا "سازِ مستقبل"

کی تفسیر پڑھیں گے۔

میرے تاثر کا خلاصہ یہ ہے کہ پرویز صاحب کی تین نظمیں یعنی "فن کا تضاد"

اور "رقصِ حیات" ان کی شاعری کا نچوڑ ہیں، اس لئے کہ ان کے اندر پرویز

صاحب کی شاعرانہ حسیات ان کا فلسفۂ حیات، ان کے سیاسی مزعومات اور

ان کی انسانیت پرستی اپنے تمام طرح جلوہ گر ہوئی ہے۔

بلاشبہ باعتبارِ فن پرویز صاحب پہلے صف کے شاعر ہیں۔ ان کے

کلام میں شعریت کی روح سمٹ آئی ہے۔ اِن کا احساس گہرا ہے اور اُن کا بیان بےحد درجہ دِل نشیں، جو خیال کو دلہن بنا کر رکھ دیتا ہے!

ل۔ احمد۔ اکبر آبادی

۱۵ر جولائی ۱۹۵۶ء
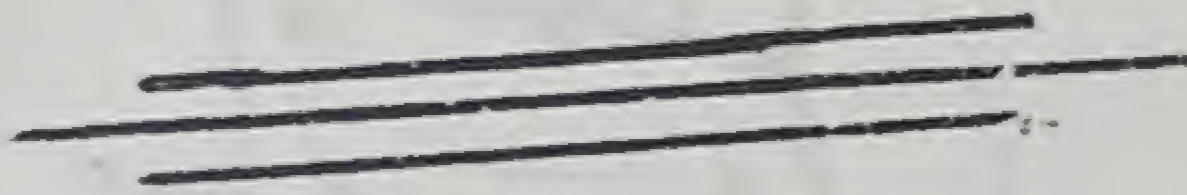
(۱)

سازِ مستقبل

کتنے اصنام ناتراشیدہ
پتھروں ہی میں کسمساتے ہیں

کتنے ہی ناشگفتہ لالہ و گل
ذہن بلبل کو گدگداتے ہیں

کتنے ہی جلوہ ہائے نادیدہ
ابھی پردے میں مسکراتے ہیں

ناسرائیدہ کتنے ہی نغمے
دل کے تاروں سے لپٹے جاتے ہیں

بے جلائے ہوئے دِئے کتنے
رات ہوتے ہی جھلملاتے ہیں

کس نے چھیڑا ہے سازِ مستقبل؟
آج لمحات گنگناتے ہیں،

لینن

رجز انقلاب

میں ہوں اِک زندہ حقیقت، میں ہوں دل کا اضطراب
میں نومبر میں ہوں لینن، میں ہوں روحِ انقلاب

میں ہوں طوفاں، میں تلاطم، میں ہوں شعلہ، میں ہوں
میری ٹھوکر میں زمانہ، میری زد میں غرب و شرق

میں ہوں محنت کی تمنّا، میں مشقّت کی اُمنگ
گونجتی ہے میری سانسوں میں صدائے طبلِ جنگ

میں ہوں شمشیرِ بغاوت، میں ہوں تیغِ انتقام
غیرتِ مزدور کے ہونٹوں پہ ہے میرا ہی نام

میں ہی دیرینہ تمنا ہوں دلِ ایّام کی
میرے آئینے میں ہے تصویر صبح و شام کی
ہر نفس میں ہے اجالا، ہر نظر میں روشنی
میں تڑپتی آرزو ہوں سینۂ تاریخ کی

جس جگہ بھی ہو تشدد جس جگہ بھی ہو ستم
صورتِ طوفاں پہنچتے ہیں وہاں میرے قدم
ہٹ نہیں سکتی کسی خطے سے بھی میری نگاہ
ہر جگہ ہے فوج میری، ہر جگہ میری سپاہ
سینۂ تاریخ پر کندہ ہیں میرے نقشِ پا
کاروانِ زندگی کا میں ہوں واحد رہنما

آفاقیت
universality

جنگ میں آگے رہا ہوں بادشاہوں کے خلاف
تیغ اٹھی ہے مری حشمت پناہوں کے خلاف
دے چکا کل روس میں سرمایہ داری کو شکست
آج ہوں ہر خطۂ بیدار میں خنجر بدست

میں ہوں مزدوروں کا ہمدم، میں کسانوں کا رفیق،
میں ہوں مظلوموں کا مونس، بے زبانوں کا رفیق،
کارخانہ میری محفل، کھیت میری رقص گاہ
جیل کی دیوار کو بھی پھاند جاتی ہے نگاہ
رعب ایٹم بم کا میرے دل پہ چھا سکتا نہیں
زور ڈالر کا مری گردن جھکا سکتا نہیں
سازشِ "اطلانٹک" ہو یا فریب مارشل
بازوؤں کو میرے کر سکتا نہیں کوئی بھی شل
"یو۔ این۔ او" میں حلقہ بندی گرچہ ہے میرے خلاف
مجھ سے کر سکتا نہیں لیکن زمانہ انحراف
کوئی ظالم بھی مجھے برباد کر سکتا نہیں
زندگی دنیا میں جب تک ہے میں مر سکتا نہیں

پریسیڈنسی جیل ۱۹۴۹ء

غزل

دل کی دھڑکنوں سے اک داستاں بنانا ہے
آپ کی نگاہوں کو ہم زباں بنانا ہے

ماہ و خور اُگانے ہیں کہکشاں بنانا ہے
اے زمیں! تجھی کو اب آسماں بنانا ہے

شوق کے تسلسل کو داستاں بنانا ہے
اک جہاں مٹانا ہے اک جہاں بنانا ہے

ہیں مرے تصور میں اُن کے سُرخ رخسارے
اور انہی سے دُنیا کو گلستاں بنانا ہے

گلفروش تھا مالی، ہو گیا چمن خالی،
آج پتے پتے کو باغباں بنانا ہے
اپنے سُرخ ہونٹوں کی مسکراہٹیں دے دو
بجلیوں کی یورش میں آشیاں بنانا ہے
باندھ کر کفن سر سے یوں کھڑا ہوں مقتل میں
جیسے سرفروشوں کا کارواں بنانا ہے
میری زندگی میں تم اپنی دِل کشی بھر دو
وقت جیسے ظالم کو مہرباں بنانا ہے
آج اُنکی آنکھوں سے جھانکتی ہیں تلواریں
دِل کی آرزوؤں کو سخت جاں بنانا ہے

تلوار

اے پیاری تلوار! ہمارے دُکھوں کی غمخوار!
اُترا ہے کیوں چہرہ تیرا پھیکے کیوں رُخسار
زنگ سے سُندر رُوپ ڈھکا ہے کُند ہے بالکل دھار
گردِ غلامی صدیوں کی ہے، حال نہ ہو کیوں زار
دیش اِدھر بیمار پڑا ہے تو ہے اُدھر بیمار
اے پیاری تلوار!

زنگ کی چادر اوڑھے اوڑھے گھُٹتا ہوگا دم
صدیوں کی اِس قید میں تو نے کتنے سہے ہیں غم
وقت کے بھاری قدموں ہی نے روندا تھا کیا کم
اِس پر طُرّہ یہ کہ تجھ کو بھول گئے خود ہم
سچ مچ تجھ کو ہم نے بنا کر رکھا ہے ناچار
اے پیاری تلوار!

دھوپ کی سختی سہتے سہتے کتنے کال
تیری سوکھی پیاسی زباں سے کھیلے ماہ و سال
لاغر بالکل جسم ہوا ہے رحم کے قابل حال
دشمن چھین کے روزی تیری ہو گئے مالا مال

لے لے بڑھ کر بدلہ اپنا تو تو ہے خونخوار
اے پیاری تلوار

آخر کب تک فاقے ہو فاقہ تو تو ہے خونریز
قوم و وطن کا حال رہے گا کب تک یاس انگیز
خشک رگوں میں چاہیئے ہونی خوں کی روانی تیز
جسم میں طاقت آجائیگی توڑ تو دے پرہیز

تیرے ہلکے پھلکے لقمے ملک کے ہیں غدّار
اے پیاری تلوار!

تیرا میان میں رہنا جیسے بن میں ناچے مور
یا ہو جیسے رات کی چادر سر سے لپٹے بھور

غداروں کے دل ہی کتنے سب ہیں چور
ان پر تو ہے بھاری اب تک لاکھ بھی ہو کمزور
چھوڑ دے حجرہ ہمیاری کا کچھ تو دکھا رفتار
اے پیاری تلوار!

نقش قدم پر تیرے ہی چل کر برق ہوئی مشہور
سیکھ کے تیری چال ہوا ہے طوفاں تک مغرور
راہ میں کاسے کتنے سروں کے توڑے گئے ہیں چور
آج بھی تیرے پاؤں نہیں ہیں چلنے سے معذور
اک اک گام پہ تن کر اپنے دشمن کو للکار
اے پیاری تلوار!

قید غلامی میں ہے بھارت عبرت کی تصویر
قوم کے سینے میں چبھتی ہے سانس بھی بن کر تیر
اپنے وطن میں قیدی ہیں ہم پھوٹی ہے تقدیر
سات سمندر پار سے ڈھل کر آئی ہے زنجیر

کردے اس زنجیر کے اک اک حلقے کو بیکار

اے پیاری تلوار!

ہند ہے جس کی عظمت رفتہ سارے جہاں کو یاد

صدیوں کی محکومی سے ہے آج غلام آباد

ہمت ہارے، پاؤں پسارے قوم کے ہیں افراد

گرد غلامی سے چہروں کی رونق ہے برباد

دھو دے اپنے پانی سے دھو دے چہروں کی پھٹکار

اے پیاری تلوار!

تیرے ہوتے پیارے وطن میں غیروں کا ہو راج؟

تجھ سے غیرت بگڑی کیوں ہے، روٹھی ہے کیوں لاج؟

ظلم و ستم کے ملک کو کر دے ٹھوکر سے تاراج

ہمت کر اے ہمت والی چھین لے بڑھ کر تاج

تیرا ہی سنسار ہے آخر تیرا ہی سنسار

اے پیاری تلوار!

۱۹۴۶ء (جہازیوں کی بغاوت کے موقع پر)

غزل

تضادات سرمایہ داری نے مارا
شکاری کو آخر شکاری نے مارا

زمیں مرکزِ سطوتِ زندگی تھی
اسے آتشِ شہریاری نے مارا

مٹی صورتِ حسن عجزِ نظر سے
تصور کی ناکردہ کاری نے مارا

نہ ذوقِ تبسم نہ شوقِ مسرت
تجھے لذتِ اشکباری نے مارا

تجھے شامت بے لگامی نے لوٹا

تری عادت نے سواری نے مارا

گری جا رہی سروں سے کلاہیں

سبک دستیٔ تاجداری نے مارا

نہ آئیں نظر تجھکو سورج کی کرنیں

روایات اختر شماری نے مارا

۵۲ء

بنت ہمالہ

آہ گنگا! یہ حسین پیکر بلّور تیرا!

تیری ہر موج رواں جلوۂ مغرور تیرا!

چور مغرب سے مگر دل ہے بہت چور تیرا

جھانکتے ہیں ترے گرداب میں ناسور تیرا

ظلم ڈھائے ہیں سفینوں نے ستمگاروں کے

زخم اب تک ترے سینے پہ ہیں پتواروں کے

محو رہتے تھے ستارے تری مے پینے میں

چاند منہ دیکھتا تھا تیرے ہی آئینے میں

خلوتِ مہرِ درخشاں تھی ترے سینے میں
تیری تابانیاں آتی نہ تھیں تخمینے میں

آج روتی ہے مگر تیری جوانی تجھکو
کھا گیا آ کے یہاں "ٹیمز"[1] کا پانی تجھکو

آہ اے کوہِ ہمالہ کے عروسِ سیّال!
تیری موجوں میں جمال اور ترے طوفاں میں جلال
تیرے دامن پہ کبھی بیٹھی نہ تھی گردِ ملال
منہ ترا پونچھتا تھا چاند کا سیمیں رومال

زخم سینے پہ لئے آج ہیں دھارے تیرے
اُف کہاں ڈوب گئے چاند ستارے تیرے!

رنگ دوزخ کو چھپائے ہے قبا کے اندر
ہولناک آج ہے کتنا یہ دھڑکتا منظر
شام ہی شام نظر آتی ہے کیوں ساحل پر؟
کیوں تری موجوں سے چھنتی نہیں انوارِ سحر؟

[1] انگلستان کا دریائے "ٹیمز"

روشنی کیوں ہوئی جاتی ہے گریزاں تجھ سے؟
کیوں اندھیروں کے ہیں لپٹے ہوئے طوفاں تجھ سے؟

آج ساحل پہ نظر آتی ہے جلتی ہوئی آگ
آدمیت کا سُلگتا ہے ہواؤں میں سُہاگ
آج ہے سازِ سیاست کا بھیانک سا راگ
پھن اُٹھائے ہوئے بل کھاتے ہیں شعلوں کے ناگ

آج انسان کو ڈستی ہیں ہوائیں تیری
زہر سے کتنی ہیں لبریز فضائیں تیری!

آئی ہے ٹیمز سے اِک موجِ رواں گاتی ہوئی
تجھ کو آزادی کے پیغام سے بہلاتی ہوئی
روحِ میخانہ لیے شوق کو بھڑکاتی ہوئی
ناز کرتی ہوئی ہنستی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی

لاکھ الجھا کریں، زلفوں میں اُلجھنے والے
اِس کے عشووں کو سمجھتے ہیں سمجھنے والے

لیکن اے بنتِ ہمالۂ تیری عظمت کی قسم
سیل کے سانچے میں ڈھالی ہوئی رفعت کی قسم
تیرے جلووں کی قسم، تیری لطافت کی قسم
تیری موجوں سے اُبھرتی ہوئی ہمت کی قسم

اب تری آنکھوں کو نمناک نہ ہونے دیں گے
دامنِ نازنہ ترا چاک نہ ہونے دیں گے

۔۔ کرپس مشن

(کرپس مشن کی آمد کے موقع پر) ۱۹۴۵ء

غزل

ہوتا ہے ختم حشر پہ سارا سفر ابھی
ہے زندگیٔ شوق بہت مختصر ابھی

ہے تابناک تیرگیٔ سیم و زر ابھی
آیا نہیں ہے وقتِ طلوعِ ہنر ابھی

جلوے ہیں حسنِ محض کے طوقِ گلوئے شوق
زندانیوں میں ہے نگہِ معتبر ابھی

عرفانِ رنگ و بو سے ہے محروم چشمِ شوق
باہر ہیں صحنِ باغ کے اہلِ نظر ابھی

کیفِ جنوں میں شرکتِ احباب ہے حرام
دیوانگیٔ دِل نہیں دیوانہ گر ابھی

حُسنِ زمیں فرازِ نگہ سے ہے سوگوار
اُتری نہیں ہے بامِ فلک سے نظر ابھی

کیوں کر ہو بار یابِ تجلّی حیات کی
قصرِ جمالیات ہے بے بام و در ابھی

آئے کہاں سے چہرۂ افکار پر چمک
ہے ذہنِ شب گزیدہ کو خوفِ سحر ابھی

کچھ دھوپ اور پڑنے دو افکارِ تازہ کی
ناپختہ ہیں نہالِ سخن کے ثمر ابھی

۱۹۴۷ء

میرا فن کار

ذہن کی رونقِ گلزار نہ چھینو مجھ سے
سُرخیٔ چہرۂ افکار نہ چھینو مجھ سے
استعاروں کی جوانی کو نہ پامال کرو
حُسنِ تشبیہ ضیا بار نہ چھینو مجھ سے
میری تخئیل کا پھاڑو نہ رِجائی ملبوس
فکر کا جامۂ زرتار نہ چھینو مجھ سے
ہونے دو ماند نہ رخسارِ معانی کی دمک
میرے الفاظ گہربار نہ چھینو مجھ سے

واردات دِل روشن کو نہ چُپ لگ جائے

تُم مری قدرتِ اظہار نہ چھینو مُجھ سے

تلخ کامی سے نہ مغلوب کہیں ہو جاؤں

میری شیرینیٔ گفتار نہ چھینو مُجھ سے

کاٹ کر پر نہ تخیّل کے تماشہ دیکھو

اوج پرِ واز کا پندار نہ چھینو مُجھ سے

زُمرِ اوہام کو بخشو نہ عقیدوں کا رنگ

تُم مری جرأتِ انکار نہ چھینو مُجھ سے

جو تصوّر نے تراشی ہیں بہ تحریکِ حیات

عالمِ نو کے وہ افکار نہ چھینو مجھ سے

یاس کی گود میں سو جائیں نہ جذبات کہیں

اضطرابِ دِل بیدار نہ چھینو مجھ سے

مجھکو بے کیف سکوں کی نہ اُڑھاؤ چادر

روحِ بیتاب کے آثار نہ چھینو مجھ سے

سر نہ حالات کے قدموں پہ کہیں جھک جائے
عظمتِ فطرتِ خود دار نہ چھینو مجھ سے

تلخ یکسانیوں کی تپشِ بے نہا ہی نہ کرو
شوق کی ہمتِ بیکار نہ چھینو مجھ سے

تم نہ توڑو مری معصوم اُمنگوں کا شکوہ
دل کی آرائشِ دربار نہ چھینو مجھ سے

مختصر یہ کہ جسے دل میں لئے پھرتا ہوں
وہ مرا دوست، وہ فنکار نہ چھینو مجھ سے

صرف پاکر ذرہ گوہر میں نہیں جی سکتا
اپنے فنکار کو کھو کر میں نہیں جی سکتا

سنہ ۱۹۴۸ء

پال رابسن کے نام

شوق در رنگ جا رہا ہے کیا کروں
آج دِل گھبرا رہا ہے کیا کروں

ہو رہے ہیں جمع کلکتہ میں معمارانِ امن
بن رہا ہے خاکہ تعمیر تبسم کے لئے
گوش بر آواز ہیں دُنیا کے فنکاران امن
رابسن کے عزم پروردہ ترنم کے لئے

اے اسیری کی مصیبت کیا کروں
کیا کروں اے شوق شرکت کیا کروں

شہر کی رونق بڑھائیں اہلِ دِل، اہلِ قلم

رہنما ملکوں کے آئیں لے کے پیغامِ سحر
سازِ سعیِ امن کے وجد آفریں ہوں زیر و بم
اور یہاں رہ جائے ٹکرا کر سلاخوں سے نظر

شوق کی تسکیں کا ساماں کیا کروں
کیا کروں اے کنجِ زنداں کیا کروں

توبہ توبہ شوق کی شدت میں یہ کیا کہہ دیا
کیوں میں بھولا "جنگِ زنداں بھی برائے امن ہے"
نغمہ سازِ امن کی سوگند اب یاد آ گیا
قیدیوں کا گیت بھی جزوِ صدائے امن ہے

گیت اب زنداں سے باہر جائیں گے
رابسن! تم گاؤ ہم بھی گائیں گے

پریسیڈنسی جیل سنہ ۴۹ء

غزل

میری دشمن، مری فریاد ہے، معلوم نہ تھا
ہم نوا ہی مرا صیّاد ہے، معلوم نہ تھا

ظلم توفیقِ خداداد ہے معلوم نہ تھا
جُرم بس جرأتِ فریاد ہے، معلوم نہ تھا

بوئے گُل، موجِ صبا، ذوقِ نوا سب پابند
ایک صرصر ہے جو آزاد ہے، معلوم نہ تھا

آشیانے کو سجاتا ہے چمن میں مالی
یہ بھی اِک سازشِ صیّاد ہے، معلوم نہ تھا.

فلسفہ باغ میں آزادئ گلچینی کا
حرصِ گلچیں ہی کی ایجاد ہے، معلوم نہ تھا

ہم بہت خوش تھے، نئی شاخِ نشیمن پا کر
قفسِ نو کی یہ بنیاد ہے، معلوم نہ تھا

ہے سراسیمہ سی کچھ سعیٔ ستم بھی ان کی
اتنا ظالم دلِ برباد ہے، معلوم نہ تھا

ہم سمجھتے تھے کہ دل ہو گیا ویران پڑا
اب بھی داغوں سے یہ آباد ہے، معلوم نہ تھا

سنہ ۳۲ء

یانگسی کو سلام

(۱)

غریب چین سو رہا تھا بے کسی کی گود میں
بہار تھی کھنچی ہوئی فسردگی کی گود میں
سسک رہی تھیں نکہتیں کلی کلی کی گود میں
تڑپ رہی تھی روحِ نغمہ خامشی کی گود میں
رُخِ سحر چھپا ہوا تھا تیرگی کی گود میں
مگر اُبال پل رہا تھا یانگ سی کی گود میں
اُبال یانگ سی کا انقلابِ "ماؤ" بن گیا
اک ایک دھارا وقت کا حسین بہاؤ بن گیا
ہے سازِ آبِ "والگا" ربابِ موجِ یانگ سی

نوائے وقت نغمۂ شباب موجِ یانگ سی
حقیقتوں کا راگ ہے کہ خوابِ موجِ یانگ سی
ہے شوخیوں کی تان یا حجابِ موجِ یانگ سی
تموّجِ حیات ہے کہ تابِ موجِ یانگ سی
سوالِ دل کو مل گیا جوابِ موجِ یانگ سی

نگاہِ وقتِ یانگ سی کی موج سے لپٹ گئی
"چیانگ" کی وہ کشتئ "ٹرومنی" اُلٹ گئی

اُلٹ گئی "چیانگ" کی وہ کشتئ "ٹرومنی"
"ٹرومنوں" کی دوستی نے کی عجیب دشمنی
نظامِ ظلم و جور کا ہوا اسیر جانکنی
غرور میں بدل گئی عوام کی فروتنی
"سفید" تیز آندھیاں ہزار حقیں بنی ٹھنی
ہزار اسلحے لئے تھی پیسفک کی رہزنی
مگر عوام ناؤ کو بڑھاتے ہی چلے گئے

اِک اِک مجنور کو بُلبلا بنانے ہی چلے گئے

وہ ڈالروں کی بارشیں وہ اسلحوں کی آندھیاں
وہ سیم و زر کی سازشیں، وبالِ دِل بلائے جاں
وہ طنطنے، وہ ہمہمے، جگر نشگافِ آسماں
وہ پینترے "وہ ہتھکنڈے وہ بنیر ہائے بے اماں
چھلک رہے ہیں آج تک پرانے زخموں کے نشاں
نفس نفس، نظر نظر، دہن دہن، زباں زباں

جوان روح خاک و خوں میں لوٹ کر سنور گئی
نہا کے کھولتے لہو میں زندگی نکھر گئی

نہ کامیاب ہو سکیں وہ یانکی شرارتیں
نہ "جان بل" کی شاطری اٹھا سکی قیامتیں
سفید خام تاجروں کی لقمئی تجارتیں
ٹھہر سکیں نہ چین میں لئے ہوئے ہلاکتیں
لرز گئیں عوام سے چیانگ کی شقاوتیں

گرجتے بادلوں کی طرح چھا گئیں مشقتیں
کڑک دھمک حریف کی فسانہ بن کے رہ گئی
کہ موت بھی حیات کا بہانہ بن کے رہ گئی

(۲)

تمام چین زندگی نو کا نغمہ زار ہے
جو ان وسرخ محنتوں کے فخر کا دیار ہے
ہر اک جوان آرزو میں جوش ہے ابھار ہے
ہر اک نظر میں شوق ہے، ہر ایک دل میں پیار ہے
جدھر نظر اٹھایئے، نکھار ہی نکھار ہے
جدھر قدم بڑھایئے بہار ہی بہار ہے
ملوں کی سخت چمنیاں دھڑک رہی ہیں راگ میں
دلہن بنی بسی ہوئی ہیں کھیتیاں سہاگ میں
جہاں رقص و نغمہ سے گزر رہی ہے زندگی
نیا نگار خانہ ہے، سنور رہی ہے زندگی

ہر ایک کشت سبز سے اُبھر رہی ہے زندگی
سحر کی سُرخ چھاؤں میں نِکھر رہی ہے زندگی
مسرّتوں سے جھولیوں کو بھر رہی ہے زندگی
شکار آج موت کو بھی کر رہی ہے زندگی

ہر اِک نگاہ نیر ہے، ہر ایک سانس دائم ہے
شکار گاہِ آرزو حکومتِ عوام ہے

عروسِ امن کی کھنک رہی ہیں سُرخ چوڑیاں
کلائیاں سُنا رہی ہیں دِل کشی کی داستاں
مہک رہا ہے آرزو کے گیسوؤں کا گلستاں
حسین مانگ بن گئی ہے سجدہ گاہِ کہکشاں
شباب پر ہیں ولولے، اِک اِک اُمنگ ہے جواں
سُہاگ اس دلہن کا ہے بہار شوخ ہے خزاں

نہ غاصبانہ سازشوں کو لائے گا نِگاہ میں
سُہاگ اب ہے امن کا عوام کی پناہ میں

بدل رہی ہے حالتِ تباہِ ارضِ ایشیا
کہ دھو رہی ہیں ہمتیں گناہِ ارضِ ایشیا
بنے ہیں تازہ ولولے سپاہِ ارضِ ایشیا
ہنسی میں آج ڈھل رہی ہے آہِ ارضِ ایشیا
نہ سامراج اب رہے گا شاہِ ارضِ ایشیا
کہ چین ہی کا راستہ ہے راہِ ارضِ ایشیا

قدم قدم پہ راہ میں ہے سامنا گھماؤ کا
طریقہ انقلاب ہی ہے امن کے بچاؤ کا

عوام ایشیا کے اب فریبِ نو نہ کھائیں گے
سفید نفع خوریوں کے دام میں نہ آئیں گے
حریص ملک گیریوں کے حوصلے مٹائیں گے
ذلیل جنگ بازیوں کی گردنیں جھکائیں گے
وطن فروش سازشوں کی دھجیاں اڑائیں گے
جو پہلے کر سکے نہ تھے وہ آج کر دکھائیں گے

سلگ رہی ہیں بھٹیاں دلوں میں انتقام کی
بنیں گی بن کے جلد ہی حکومتیں عوام کی

نظام پیرِ کہنہ کو جوانیاں مٹائیں گی
پناہ ایشیا میں اب جہالتیں نہ پائیں گی
جو مٹ چکی ہیں ظلمتیں وہ لوٹ کر نہ آئیں گی
نئی سحر کی شوخیاں نئے چمن سجائیں گی
بہارِ نو کے ساز پر ہوائیں گیت گائیں گی
ہوائیں گیت گائیں گی، فضائیں گنگنائیں گی

خیال آج سُرخ ہے، نگاہ آج سُرخ ہے
نقوشِ پا کی سُرخیوں سے راہ آج سُرخ ہے

بغاوتوں کی آج تک روائیتیں جوان ہیں
جوان حافظوں میں کل کی ہمتیں جوان ہیں
جوان ہیں وہ سُرخیاں، شکائیتیں جوان ہیں
جوان خون سے لکھی عبارتیں جوان ہیں

طبیعتیں جوان ہیں ذہانتیں جوان ہیں
جوانیاں جوان ہیں، مشقتیں جوان ہیں
رگوں میں گرم خون کی روانیاں لئے ہوئے
عوام بڑھتے جائینگے جوانیاں لئے ہوئے

جو سارے ایشیا میں ہے، وہی سفر یہاں بھی ہے
وہ کارواں یہاں بھی ہے، وہ رہگذر یہاں بھی ہے
دلوں میں دردِ زندگی شباب پر، یہاں بھی ہے
وہی فغاں یہاں بھی ہے، وہی اثر یہاں بھی ہے
یہاں بھی ہے وہ شامِ غم، غمِ سحر یہاں بھی ہے
بہارِ نو کی جستجو میں ہر نظر یہاں بھی ہے
ہیں چین کے نقوش پا کہ پھول انقلاب کے
مہک کے ساتھ کھل رہے ہیں راستے شباب کے

قلم سے اپنے عہدِ نو کی تازگی بڑھاؤنگا
ادب کے خارزار کو میں گلستاں بناؤنگا

جہانِ شعر و نغمہ میں مسرّتیں بساؤں گا
تبسّمِ حیات کو میں جنگ سے بچاؤں گا
ترانہ ہائے امن سے دلوں کو گدگداؤں گا
میں سازِ موجِ گنگ پر شفق کے گیت گاؤں گا

پہنچ گیا مجھے ترا پیام موجِ یانگ سی
سلامِ موجِ یانگ سی، سلامِ موجِ یانگ سی

(یوم چین) بکسا اسپیشل جیل بنگال ۱۹۵۰ء

غزل

یہ سنبل و نسریں میرے ہیں، یہ صحنِ گلستاں میرا ہے
میں عزمِ نموئے گلشن ہوں، انعامِ بہاراں میرا ہے

میں فرق بتاؤں کس کس کو، احساس کی جب توفیق نہیں
کیفِ غمِ دوراں میرا ہے، لطفِ غمِ جاناں میرا ہے

اے موسمِ گل! تشویش نہ کر ارباب خرد کی باتوں پر
یہ پنجۂ وحشت میرے ہیں، ہر تارِ گریباں میرا ہے

احباب تباہی پر میری، مغموم نہ ہوں، ماتم نہ کریں
یہ گردشِ دوراں میری ہے، وہ فتنۂ دوراں میرا ہے

اے ناصحِ مشفق بار ہنے دے اشکوں پہ مرے تنقید نہ کر

یہ دیدۂ گریاں میرے ہیں، وہ گوشۂ داماں میرا ہے

تاریخ چمن لکھنے کے لئے کیوں ہاتھ بڑھے ہیں گلچیں کے

آغازِ گلستاں میرا تھا، انجامِ گلستاں میرا ہے

شنکیوں کی ظفریابی پہ مجھے احباب مبارکباد نہ دیں

وہ نیچی نگاہیں میری ہیں، وہ حسنِ پشیماں میرا ہے

میں بزمِ عدو میں بھی جا کر پرویز غزل خواں ہوتا ہوں

جو وقفِ ترنم ہے دل میں، وہ حسنِ غزلخواں میرا ہے

۱۹۵۳ء

رقصِ حیات

جب بزمِ ارتقا میں جلی شمعِ زندگی
تھی روشنی میں شانِ حجابِ عروس کی
گونجی فضائے شوق میں شعلوں کی راگنی
جو بڑھ کے دوسری نئی تانوں میں ڈھل گئی

ہر لَو نئی لووں کو جگاتی چلی گئی
زنجیرِ روشنی کی بناتی چلی گئی

تمثیلِ خلد و آدم و حوّا بنی حیات
افسانۂ لطافتِ دنیا بنی حیات
تاریخِ عشق و حسنِ خود آرا بنی حیات

تخلیق کا لطیف سہارا بنی حیات

فطرت بجائے جاتی ہے سازِ التفات کا
رُکتا نہیں ہے رقصِ تسلسل حیات کا

تاریخِ کائنات میں بدلا کئے نظام
ہر دورِ تازہ آیا لئے اک نیا پیام
کچھ کچھ بڑھا بھی حسن و محبت کا احترام
اب تک مگر یہاں ہے مسرت جنونِ خام

رہتی ہیں سہمی سہمی اُمنگیں شباب کی
صورت نہاں ہے زندگیٔ کامیاب کی

خطے اسی جہان میں ایسے بھی ہیں مگر
رقصاں ہے جن کے ساز پہ اب عظمتِ بشر
جو جھومتے ہیں حسن و محبت کے نام پر
ہے بادۂ شباب جہاں جنتِ سفر

گاتے جہاں ہیں لوگ ترانے نئے نئے

بنتے جہاں ہیں روز فسانے نئے نئے

تعمیر کے یہاں بھی ضیا افشاں ہیں ولولے
رگ رگ میں بن کے خون خراماں ہیں ولولے
سازِ بہارِ نو پہ غزل خواں ہیں ولولے
معمارِ تازگیٔ گلستاں ہیں ولولے

سُرخی بنا رہی ہے رُخِ کائنات کی
جنّت یہاں بھی بن کے رہے گی حیات کی

"انعام"[1]: ——— آرزوئے برادرِ نشاطِ جاں!
تسکینِ روح! عیشِ تمنّائے خانداں!
شادی تمھاری مژدۂ تعمیرِ گلستاں!
خوابِ بہارِ تازہ کی تعبیرِ کامراں!
وجد آفریں ترانۂ سازِ خیال ہے
ایسے میں ضبطِ جوشِ مسرّت محال ہے

[1]:- شاعر کا چھوٹا بھائی۔

ہے جادۂ حیات مسرت لئے ہوئے
ہے ہر قدم شباب کا جنت لئے ہوئے
گردن اُٹھاؤ عزمِ محبت لئے ہوئے
ہمت کرو نشاطِ رفاقت لئے ہوئے

منزل بھی اس جہان میں ہے رہگذر بھی ہے
بڑھتے چلو کہ کوئی رفیقِ سفر بھی ہے

تم دونوں سازِ وقت پہ گاتے ہوئے چلو
دُنیا کو نغمہ زار بناتے ہوئے چلو
کانٹوں کو راستے سے ہٹاتے ہوئے چلو
ہاں ہر قدم پہ پھول کھلاتے ہوئے چلو

بھر دو نئی اُمنگوں سے آنچل حیات کا
تم دونوں پر بھی قرض ہے کچھ کائنات کا

"کبریٰ"[1] ! میری عزیز بہن ؛ دل کی روشنی !

[1] شاعر کی چھوٹی بہن۔

ماں جائے کا غرور، بھرے گھر کی لاڈلی !
اترا رہی ہے روح کہ ہو تم دلہن بنی !
دل میں مچل رہی ہے مسرّت کی راگنی !
کب دور رہوں بہارِ طرب آفریں سے میں !
سہرے کے پھول سونگھ رہا ہوں یہیں سے میں !

ہے زندگی کے راستے پر یہ سفر نیا
تم جا رہی ہو آج بسانے کو گھر نیا
جلوے نئے ہیں وقت کے ذوقِ نظر نیا
سسرال پر پڑے گا تمہارا اثر نیا

بے تاب جذبِ شوق ہے اظہار کیلئے
لے جاؤ رونقیں درو دیوار کے لئے

تعمیرِ زندگی کے طریقے نکالنا
میخانۂ حیات میں ساغر اچھالنا
سانچے میں صبحِ نو کے زمانے کو ڈھالنا

دِل کو سنبھالتے ہوئے آنچل سنبھالنا

ہر ذرّہ ہے نشاطِ تمنّا لئے ہوئے
آگے بڑھو خوشی کا پھریرا لئے ہوئے
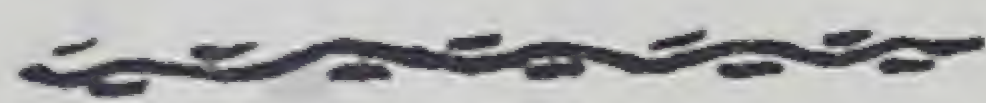
(اپنے بھائی کی اور پھر بہن کی شادی کی خبریں پاکر) بکسا اسپیشل جیل سنہ ۵ء

غزل

نظاروں نے کئے ہیں ذہن میں آباد بت خانے
تصوّر کو تراشا ہے مری چشمِ تماشا نے

بنی ہے اضطرابِ شوق دھڑکن قلبِ آہن کی
اُگے ہیں گشتنیٔ دہقاں سے رُخِ کاکل کے افسانے

مری ہمت نے توڑی ہیں یہاں انگڑائیاں جتنی
اُنھیں تاریخ میں محفوظ کر رکھا ہے دُنیا نے

میں کیوں ساقی سے جا کر بھیک مانگوں جامِ ہندیں کی
کروڑوں انگڑیوں کے کھُل گئے ہیں آج میخانے

پہاڑوں کی بلندی ہنس رہی ہے اس کی جرأت پر
چلی ہے نخوتِ لعل و گہر پتھر سے ٹکرانے
گیا وہ وقت جب اپنے گریباں چاک کرتے تھے
ستارے ٹانکنے جاتے ہیں اب دامن پہ دیوانے
ذرا بیدار تو ہو جائے غیرت تشنہ کامی کی
لبِ میخوار کو خود چوم لینگے بڑھ کے پیمانے
شعورِ باغبانی عام جب تک ہو نہیں جاتا
نظر اس وقت تک آتے رہیں گے کتنے ویرانے
ابھی سے صبحِ گلشن رقص فرما ہے نگاہوں میں
ابھی پوری نقاب اُلٹی نہیں ہے شامِ صحرا نے
طلسمِ ظلمتِ شب میں اُلجھ کر رہ نہیں سکتیں
مری آنکھوں کو چوما ہے نگارِ صبحِ فردا نے

سنہ ۵۲ء

———×———

تضاد

میں عدوئے اہرمانی، تو رفیقِ شہریاری
مری زندگی جہادی، تری زندگی فراری

تجھے خار و خس کی سطوت پہ یقینِ پائیداری
مرے ہر نفس میں رقصاں مرا عزمِ شعلہ باری

ترے ولولے ہراساں، ترے حوصلے پشیماں
مرے دل میں دامن افشاں صنمانِ کامگاری

تری یاس میں پر افشاں، تری زندگی ترساں
مرے ذہن میں خراماں مرے دل کی استواری

تری آنکھیں سہمی سہمی، تری فکر لرزی لرزی
مری روح بپھری بپھری کہ لگائے ضرب کاری

ترا حافظہ بن سکتا، تری آرزو کو سکتہ
مرا حال دوش و فردا کا پیامِ سازگاری
تجھے "محضیت" کی دنیا میں پناہ کی تمنّا
ہیں جہانِ گندم و جو میں فدائے لالہ کاری
تجھے آستانِ دولت پہ غرورِ سجدہ ریزی
میری خاکِ پائے ہمّت میں مزارِ تاجداری
ترے فلسفے پہ حاوی اَلم گریز پائی
مری حکمتِ جہاں میں یہ نشاطِ شوق طاری
تری چشمِ اشک افشاں ہیں سفینہ تیرے دل کا
مری ہر نظر سے ہنستے ہوئے آبشار جاری
تری روح پر مسلّط ترے مرگ زا عقیدے
مرے پیکرِ تصوّر میں حیاتِ تازہ ساری
ہے ترا ضمیرِ شبگوں تری حرص کا سہارا
ترے نفسِ صبح دشمن سے ہے تیری پردہ داری

ہے نظامِ گل فروشی کی بقا عزیز تجھکو
مجھے شاخِ گل سے لپٹی ہوئی ہر کلی ہے پیاری

مجھے کیفِ بادہ حاصل ہے کروڑوں انکھڑیوں سے
ہے غلام جامِ زرّیں ترا ذوقِ مے گساری

ہے کروڑوں ساغروں سے مری زندگی کی مستی
مرے نشّے سے لرزتی ہے اجل کی ہوشیاری

تو غروبِ عہدِ ماضی میں طلوعِ عصرِ حاضر
ہوں میں صبحِ شادمانی تو ہے شامِ سوگواری

تری ناوک افگنی کا وہ کمال مٹ چکا ہے
یہ جہانِ نو ہے جس میں تو شکار میں شکاری

یہ ترا اِنفعال ہے تضادِ نور و ظلمت
یہ تضادِ مرد بقدرت نہیں امرِ اختیاری

نہ چھپا اب اس حقیقت کو فسانہ در فسانہ
تری رات ختم ہوتی ہے مری صبح کا ترانہ

بکسا اسپیشل جیل - سنہ ۵۶ء

ماضی کا قید خانہ

یہ برف پوش تمدّن، یہ منجمد تہذیب
شعاعِ مہرِ درخشاں کے انتظار میں ہے

یہ صدیوں، قرنوں کا ٹھٹھرا ہوا نظامِ حیات
تمازتِ دلِ انساں کے انتظار میں ہے

روایتوں کی یہ بے روح شامِ یخ بستہ
سحر کے شعلۂ رقصاں کے انتظار میں ہے

یہ ژالہ بارِ تخیّل، یہ سرد سرد سی فکر
برشتگیٔ دل و جاں کے انتظار میں ہے

قدامتوں کا یہ انبارِ خشک و سرد و کثیف
دہکتی آگ کے طوفان کے انتظار میں ہے

یہی ہے وقت کہ ہر سانس شعلہ افگن ہو
بھرا حیات کا برقِ دشرر سے دامن ہو

یہ کیا ستم ہے کہ روحِ شبابِ لالہ و گل
نظامِ باغ کی افسردگی پہ روتی ہے
گلوں کی پیاس بجھاتی ہوئی روپہلی اوس
گیاہ و خار کی آسودگی پہ روتی ہے
ردائے شرم میں لپٹی ہوئی عروسِ بہار
چمن فروشوں کی موجودگی پہ روتی ہے
ریاضِ فکر و نظر میں کھلی ہوئی نرگس
توہمات کی بے ہودگی پہ روتی ہے
بہارِ گلشنِ تخئیلِ فکرِ انسانی
خرد کی "داہمہ آلودگی" پہ روتی ہے

مطالبہ بھی نیا ہے نئے زمانے کا
یہی ہے وقت جوانی کے مسکرانے کا

شباب کے لئے تقلید شیب بے معنی!
نہ ہونگی جھریوں سے کبھی نگہیں مرعوب
شگفتگی کو نہیں کچھ فسردگی سے کام
کہ مشترک نہیں دونوں کی فکر کے اسلوب
فسردگی کو ابھی تک فضائے دوش عزیز
شگفتگی کو تجلّیٔ صبحِ نو محبوب
ہے ذہنِ پیر نشیمن اندھیری راتوں کا
جوان فکر سے ہے جلوۂ سحر منسوب
دلیر و تند و ترقی پسند برنائی
کنیز پیریٔ رجعت پسند ہو کیا خوب!

اسیرِ کاکلِ شب آفتاب کیا ہو گا
غلامِ شیب بھی تا شباب کیا ہو گا

اٹھ اے شباب! اب اٹھ برف کے پہاڑوں پر
نگاہِ گرم سے اپنی کچھ آگ برسا دے

پڑی ہوئی ہیں دلوں پر تہیں جو ماضی کی
انھیں اب آنچ سے حالِ تپاں کی پگھلا دے
چھپی ہیں ذہنوں میں جو سرد مہریں قدریں
رگوں میں انکی ذرا خونِ گرم دوڑا دے
دبے ہیں سرد فضا نے جو نقرئی اشعار
سنہری سانسوں سے اپنی اب انکو گرما دے
دماغ و دل ہیں شہیدِ برودتِ ایام
دہکتے لمحوں کی ان کو قبائیں پہنا دے

ہے کتنی ٹھٹھری ہوئی آج زندگی پیارے
بچا کے کل کے لئے رکھ نہ اپنے انگارے

طلوعِ صبحِ درخشاں کے بعد بھی دنیا
جبیں پہ رات کے لمحات ہے سجائے ہوئے
شکار ہوتی ہے اب بھی مشقتِ نادار
کہ دام لعل و گہر اب بھی ہیں بچھائے ہوئے

ہے اب بھی خطرے میں محنت کی زندگی عزیز
ہیں چاندی سونے کے سانپ اب بھی پھن اٹھائے ہوئے

فضا میں گونجتے پھرتے ہیں آج بھی افسوس
مغنّیانِ جہالت کے گیت گائے ہوئے

وہی نظامِ کہن "اِک ضرورتِ تاریخ"
غلام اب بھی تمدّن کو ہے بنائے ہوئے

چھڑا سماج کو گذرے ہوئے زمانے سے
نِکال حال کو ماضی کے قید خانے سے

سنہ ۴۶ء
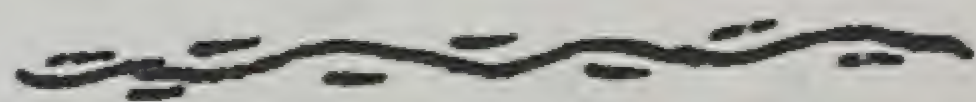
غزل

تم "خنک جذبہ" ہو، بے تابیٔ فن کیا جانو؟
کیا گذرتی ہے دمِ فکرِ سخن کیا جانو؟

خون ہے دِل میں تمہارے ابھی افسردہ خرام
سُرخ کیوں ہوتے ہیں رخسارِ چمن کیا جانو؟

میں ہوں کتنے فتنۂ گیسو کے جہاں کا معمار
سرگراں مجھ سے ہیں کیوں دار و رسن کیا جانو؟

تم تو کرتے ہو مری کلکِ سخن کو پابند
کون ہے کاتبِ تقدیرِ وطن، کیا جانو؟

میں کہ ہوں خاک نشیں، دشمنِ جامِ خسرو

میں ہی بیٹھا ہوں "مے تخت فگن" کیا جانو

تم کو ہے ناز کہ جکڑے ہوئے ہو وقت کے پاؤں

کیوں بدلتا ہے زمانے کا چلن کیا جانو

تم سمجھتے ہی نہیں اہلِ گلستاں کی زباں

مجھ سے کیا کہتے ہیں یہ سرو و سمن کیا جانو

تم تو ہو باعثِ افسردگیِ حالِ ہنر

میں ہوں تابانیِ مستقبلِ فن کیا جانو

جن کو تم دیتے ہو شوریدہ سری کا الزام

ہیں وہی خاک بسر تاج شکن کیا جانو

۵۳ء

ہم نوجواں ہیں

ہم نوجواں ہیں، جانِ بہاراں، مرگِ خزاں ہیں
شادابیوں کا گلشن بداماں، اک کارواں ہیں
جام و سبو کی، کیفِ نمو کی، روحِ نہاں ہیں
ہم آتشِ گل کی رقص کرتی چنگاریاں ہیں
ہم نوجواں ہیں،

شعلے غضب کے رہتے ہیں رقصاں قلب و جگر میں
سانسیں ہماری سورج کی کرنیں شوقِ سحر میں
سوراخ کردیں ظلمت کدوں کے دیوار و در میں
سوزِ دروں سے اپنی نگاہیں آتش فشاں ہیں
ہم نوجواں ہیں

بجلی کے دھارے ہر وقت رقصاں اعصاب میں ہیں
سرکش شرارے طوفاں بداماں اعصاب میں ہیں
سلگے ستارے خورشید افشاں اعصاب میں ہیں
دہکی رگوں میں سیال آہن کی ندیاں ہیں
ہم نوجواں ہیں

وہ ہوں دفاتر، یا درسگاہیں یا کارخانے
جذبات کے یا افکار کے ہوں وہ آشیانے
سبزے کی مسند، کالے دھوئیں کے یا شامیانے
سن کر صدائے سازِ جوانی سب نغمہ خواں ہیں
ہم نوجواں ہیں

بجلی سے لرزے حسنِ تبسم، ممکن نہیں ہے
ڈالر سے کانپے شانِ تکلم، ممکن نہیں ہے
ایٹم سے سہمے شوقِ ترنم، ممکن نہیں ہے
کیا موت کا ڈر خود زندگی کی روحِ رواں ہیں

ہم نوجواں ہیں

وہ والگا کے سیلِ رواں کی رنگیں کہانی
وہ سرخ یورپ کی ندیوں کا گلرنگ پانی
وہ یانگسی کی موجِ طرب کی شیریں زبانی
ہاں سب ہماری ہی کل کی توڑی انگڑائیاں ہیں
ہم نوجواں ہیں

اطلانتک کے گرداب کا ہے انجام خواری
ہے پیسفک کے بزدل تھپیڑوں پر خوف طاری
چلتی رہی ہے، چلتی رہے گی کشتی ہماری
شعلوں کے دریا ہیں ناخدائے امن و اماں ہیں
ہم نوجواں ہیں

بھیگی مسیں پھر کیفِ نمو کا حق مانگتی ہیں
تسکینِ ذوقِ جام و سبو کا حق مانگتی ہیں
بزمِ جوانی ہیں ہائے ہو کا حق مانگتی ہیں

بارود مل کر کس کو ڈراتی یہ جھریاں ہیں
ہم نوجواں ہیں

باغ نشاطِ حسن و محبت لے کر رہیں گے
صبح تبسم، شام مسرت لے کر رہیں گے
جو چھن گئی ہے وہ اپنی جنت لے کر رہیں گے

بے کار ہر ہم بوڑھے جہنم کے پاسباں ہیں
ہم نوجواں ہیں

کلکتہ یوتھ کانفرنس ۱۹۵۱ء

غزل

موقع پاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا

کم سے کم میں غمِ دنیا کو بھلا سکتا تھا
پہ تری یاد نے یہ کام بھی کرنے نہ دیا

اس رفاقت پہ فدا میری پریشاں حالی
اپنی زلفوں کو کبھی تو نے سنورنے نہ دیا

تیری غمخوار نگاہوں کے تصدق کہ مجھے
غمِ ہستی کی بلندی سے اترنے نہ دیا

میں نے دیکھا ہے ترے حُسنِ خود آگاہ کا رعب
اجنبی نظروں کو چہرے پہ بکھرنے نہ دیا
وہ تری سرخیٔ عارض کے قریب آ نہ سکی
رنگ جس فکر کو بھی خونِ جگر نے نہ دیا

حسن ہم درد ترا ہم سفرِ شوق رہا
مجھکو تنہا کسی منزل سے گذرنے نہ دیا
کتنی خوش ذوق ہے تیری نگہ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا، جام کو بھرنے نہ دیا

۱۹۵۳ء

بربطِ دل

کیوں خوشی سے چمکتی ہیں آنکھیں
چہرے کیوں آج جگمگاتے ہیں
کیسی اُٹھتی ہیں لہریں ہونٹوں سے
آج کیوں لوگ مسکراتے ہیں

وجد کرتا ہے آج کیوں سبزہ
پتّے کیوں تالیاں بجاتے ہیں
نغمہ ہی نغمہ ہے ہواؤں میں
لے کے بادل کہاں سے آتے ہیں

بات کیا ہے کہ آج زنداں کی
سختیاں ہم بھی بھولے جاتے ہیں

دیکھ کر طور مسکرانے کا
فق ہے رنگ آج قید خانے کا

یہ سلاخیں، یہ پہرے، یہ تالے
کالے قانون کی یہ زنجیریں
یہ ہوا یہ پہاڑ یہ بن باس
یہ قضا کی مہیب تصویریں
یہ نظر بندیاں طویل و دراز
سر پہ تھوپی ہوئی یہ تقصیریں
جھوٹ کی یہ ذلیل سی سازش
جھوٹے الزام بھونڈی تعزیریں
یہ بریدہ سے نامہ و پیغام
باتیں مجروح، زخمی تحریریں

دل میں رقصاں ہے روشنی پھر بھی
مسکراتی ہے زندگی پھر بھی

جسم پابندیوں میں لاکھ سہی
رُوح پُرشوق پھر بھی ہے آزاد
لاکھ بھی دِل پہ ہو اثر انداز
ہجرِ محبوب و قیدِ بے میعاد
پھر بھی زنجیر توڑ دیتی ہے
چھیڑ کر رُوح کو کِسی کی یاد
ہے تصوّر میں اِک حسیں تصویر
دِل اُمنگوں سے آج ہے آباد
رُوح میں چٹکیں نغموں کی کلیاں
ڈھل گئے ساز میں لبِ فریاد

نغمہ گونجا جو بربطِ دِل کا
شور شرما گیا سلاسل کا

بکسا اسپیشل جیل۔ سنہ ۵ء

غزل

دل میں مرے خیال ہے تنہا نہ آپ کا
مے خانہ بنتا جاتا ہے پیمانہ آپ کا

جانا کوئی ضرور نہیں ماورائے ارض
آخر یہیں کہیں تو ہے کاشانہ آپ کا

رگ رگ میں کھبتے جاتے ہیں شعلے حیات کے
خود شمع بنتا جاتا ہے پروانہ آپ کا

دل بن رہا ہے شانۂ گیسوئے روزگار
اب میرے سر میں رہتا ہے سودا نہ آپ کا

رنگیں بنا دیا ستم روزگار نے
بے رنگ ہو چلا تھا کچھ افسانہ آپ کا

زنجیریں ٹوٹی جاتی ہیں زورِ بہار سے
اب رقص کرنے والا ہے دیوانہ آپ کا

سنہ ۴۸ء

خوش آمدید

سرخوشیٔ موسمِ شبنم چکاں لائے ہو تم
تازگیٔ برگ ہائے ضوفشاں لائے ہو تم
لالہ و گل کا سکوتِ نغمہ خواں لائے ہو تم
طائرانِ باغ کا سوزِ جواں لائے ہو تم
اپنی سانسوں میں چھپا کر گلستاں لائے ہو تم
ساتھیو خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید!

دھوپ گیہوں کی، چمکتے چاولوں کی چاندنی
چاند سورج کی یہ فصلیں زرنگار و لفریبی
سرخ اور تازہ پھلوں کی یہ شفق پیراہنی
ڈالیوں کی مانگ شبنم کے ستاروں سے بھری
سرزمیں سے اپنی جیسے آسماں لائے ہو تم

ساتھیو خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید!!
گنگناتے کارخانوں کے دھوئیں کا پیچ و تاب
مسکراتی چمنیوں کی گرم سانسوں کا رباب
بکھیرتی گاتی مشینوں کا طرب افزا شباب
انکھڑیوں سے ماؤں کی چھلکے ہوئے سرشار خواب
صنعتِ بیدار کی انگڑائیاں لائے ہو تم
ساتھیو خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید!!
مدتوں سینوں میں جو بھی کے کسانوں کے پلے
جو پسینہ بن کے مزدوروں کے ماتھے سے ڈھلے
سر اُٹھا کر چھاؤں میں جو تیغ و خنجر کی پلے
چیانگ کے دورِ ستم میں جو چراغ آسا جلے
ان حسیں خوابوں کی تعبیر جواں لائے ہو تم
ساتھیو خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید!!
علم و فن کا ربطِ عظمت بجانے ولولے

زمزمے محنت کے دُنیا کو سُناتے ولولے

خواب کا ہیروں کے پرچم اڑاتے ولولے

مسکراتے، رقص کرتے، گیت گاتے ولولے

کیسے پیارے ولولوں کا کارواں لائے ہو تم

ساکنینِ خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید!

صورتِ گیسو جو آندھی میں سنورتی ہی گئی

جو حوادث کے دبانے پر اُبھرتی ہی گئی

جو نہا کر خون میں بھی رقص کرتی ہی گئی

جو مثالِ چہرۂ خوباں نکھرتی ہی گئی

اس نئی جمہوریت کی داستاں لائے ہو تم

ساکنینِ خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید!

گنگنائیں محنتیں، اہلِ سخن گانے لگے

دانشیں گانے لگیں، خوابیدہ فن گانے لگے

اِک نئی دُھن میں خیالاتِ کہن گانے لگے

یانگ سی کے ساز پر گنگ و جمن گانے لگے

بر ربطِ مستقبلِ ہندوستاں لائے ہو تم

ساتھیو خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید!

نیند کی ماتی تمناؤں نے آنکھیں کھول دیں

کتنے قیسوں، کتنی لیلاؤں نے آنکھیں کھول دیں

دل کی محوِ خواب دنیاؤں نے آنکھیں کھول دیں

باغ تو ہیں باغ، صحراؤں نے آنکھیں کھول دیں

اپنے گلشن کی بہارِ بے خزاں لائے ہو تم

ساتھیو خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید!

ہو مبارک شہر کلکتہ کو یہ روزِ سعید

پیاسی آنکھیں پی رہی ہیں بادۂ سرجوشِ دید

کیا کہوں عالم خوشی کا عید ہے بس آج عید

ہے یہ میری نظم ان پیاری امنگوں کی رسید

چین سے جتنی امنگیں بھی یہاں لائے ہو تم

سانھیو خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید!

چین سے کہنا یہاں پیر و جواں بیدار ہیں
امن پرور دوستی کے پاسباں بیدار ہیں
تازہ تازہ حوصلوں کے کارواں بیدار ہیں
سرزمینِ گوبدھ کی ہمدردیاں بیدار ہیں
شکریہ لے جاؤ جب بیداریاں لائے ہو تم
سانھیو خوش آمدید! اے دوستو خوش آمدید!

(کلکتہ میں چینی ثقافتی وفد کی آمد پر) ۱۹۵۱ء

اُجالا

یہ خُردسال "اُجالا" یہ تیرگی کا سپُوت
یہ رُو سیاہیٔ شامِ بلا کا نُورِ نظر
حریفِ رات کے دل کا یہ عکسِ نو بہ فریب
ہوس کی ساحرۂ تیرہ رُخ کا لختِ جگر
یہ غازہ سازِ فرنگی کا اِک ثبوتِ کمال
یہ "گورے تاج" کی مشاطگی کا اَوجِ ہنر
یہ "کوہ نور" کے چہروں کی اِک نوازشِ خاص
سفید تخت کا یہ سحرِ بندگی گُستر
یہ تاجرانہ سیاست کی نقرئی سازش
یہ خسروانہ شرارت کی صُبحِ شب پرور
یہ برصِ خام قیادت کی فاتحانہ نمُود
یہ داغدارِ سیادت کا رنگِ تیغ و کمر

یہ خُردسالی کا دعویٰ، یہ نازِ معصومی
سفید بالوں کا سر پہ لئے ہوئے لشکر
یہ سادہ روئی طفلی کا پے بہ پے اعلان
یہ جھرّیوں کی سیاست نقاب کے اندر

مسافرانِ شبِ تار پر یہ روشن ہے
کہ اور ابھی انھیں کرنا ہے ظلمتوں میں سفر
مگر تصوّرِ مہرِ مبیں کو کیا کہیئے
کہ رات ہی سے درخشاں ہے خاکِ راہ گذر
ہے سطوتِ شبِ تاریک ریگ کی دیوار
ہوائے تند کے دامن میں پل رہی ہے سحر
جواں اُجالے کا رقصِ شباب دیکھیں گے
ہم اپنی گود میں کل آفتاب دیکھیں گے

غزل

یاد ہیں آپ کے توڑے ہوئے پیماں ہم کو
کیجئے اور نہ شرمندۂ احساں ہم کو

دل میں داغوں کی یہ کثرت نہیں دیکھی جاتی
دیجئے اور نہ انعامِ بہاراں ہم کو

آپ پھر لائے ہیں آزادیٔ نو کا مژدہ
پھر بلانا تو نہیں گوشۂ زنداں ہم کو

آپ کے کوچۂ خوں میں بہت دیکھے ہیں
بخشئے اور نہ اپنے گل و ریحاں ہم کو

تیغِ خونریز کے دیکھے ہیں لگائے ہوئے باغ
کیوں دکھاتے ہیں نیا خوابِ گلستاں ہم کو

دیجئے آپ نہ اب راحتِ منزل کا فریب

رہ نما مان چکا ہے غمِ دوراں ہم کو

زخمِ افلاس سے مرہم کا نہ کیجیئے وعدہ
یاد آجاتے ہیں سونے کے نمکداں ہم کو

مانگیئے اب نہ گہر ریزِ جبیں کے موتی
یاد ہے آپ کی ہر سازشِ داماں ہم کو

آپ کیوں آئے ہیں اب شمعِ عنایت لے کر
روشنی بخش رہا ہے دلِ سوزاں ہم کو

ناخدائی کی بھلا آپ کو زحمت کیوں دیں
ہم ہیں طوفان کو سمجھے ہوئے طوفاں ہم کو

شدّتِ درد کو آتا ہے مداوا کرنا
کیجیئے آپ نہ شرمندۂ درماں ہم کو

رات ہے سایہ فگن آپ کی پیشانی پہ
بخشنے آئے ہیں کیا صبحِ درخشاں ہم کو

دِل میں محفوظ ہے کتنے ہی اندھیروں کی یاد

کیجئے اور نہ ممنونِ چراغاں ہم کو

وعدۂ لطفِ سحر ہو کہ عتابِ شبِ غم
یاد ہے آپ کی ہر سعئِ پشیماں ہم کو

آپ کیوں وعدۂ فردا کا اٹھاتے ہیں رباب
لحنِ پرویز میں ہوتا ہے غزلخواں ہم کو

۱۹۵۱ء

والگا کو سلام

یاد آتا ہے وہ انیس سو سترہ ۱۹۱۷ء کا جلال
تیرے سینے کی وہ کھولن، وہ ترے دِل کا اُبال
وہ نیا ماہِ نومبر، وہ جگر گوشۂ سال
زار کے بعد کرینسکی کی وہ شامِ زوال

تیرے ساحل پہ ہوئی صبحِ طرب محوِ خرام
والگا لال سلام!

یانگ سی نے تیری خدمت کو ہوائیں بھیجیں
ٹیمز نے تیری محبت میں گھٹائیں بھیجیں
رودِ گنگا نے اثر بار دعائیں بھیجیں
دلِ ہر جوئے خراماں نے وفائیں بھیجیں
تھا طلاطم ترا سیّال مشقّت کا امام
والگا لال سلام!

کولچک[1] اور ڈینیکن کے سفینے نہ رہے
افسرِ "زار" کے وہ ٹوٹے نگینے نہ رہے
گرم غدّاروں کے دہکے ہوئے سینے نہ رہے
یوں ہوئے ٹھنڈے کہ ماتھوں پہ پسینے نہ رہے
ظلم کو تیرے خیالوں نے دئے زہر کے جام
والگا لال سلام!

[1] سوویت روس کے خلاف مسلح بغاوت کرنیوالے دو غدار

کتنے چہرے ہیں گرفتارِ ندامت جب سے
ان کے سینوں میں ہے احساسِ ہزیمت جب سے
ان کی رگ رگ میں رواں رہتی ہے نفرت جب سے
ان کی ہر سانس ہے طوفانِ شرارت جب سے
کر نہیں سکتے مگر تیرے تھپیڑوں سے کلام
والگا لال سلام

جنگ بھی کر کے ستم گاروں نے کل دیکھ لیا
کر کے غدّاری بھی غدّاروں نے کل دیکھ لیا
قول سے پھر کے بھی مکّاروں نے کل دیکھ لیا
آگ برسا کے بھی بمباروں نے کل دیکھ لیا
تیرے پانی سے ہوئی شعلوں کی سازش ناکام
والگا لال سلام

آج بھی سلسلۂ مکر و ریا باقی ہے
اب بھی ہٹلر کے سپوتوں کی جفا باقی ہے

موت برسائے عقابوں کی گھٹا باقی ہے
کل کے بارود فروشوں کی بلا باقی ہے
ہر کجھنور کو ترے معلوم ہے ان کا انجام
وانگا لال سلام

ندیوں میں ہے رواں چین کی عظمت بن کر
مشرق یورپ میں رواں موجِ لطافت بن کر
رگِ مشرق میں تپاں خونِ بغاوت بن کر
قلبِ گیتی میں نہاں جوشِ مشقّت بن کر
تو وہ دریا ہے کہ ہر بوند میں ہے تیرا مقام
وانگا لال سلام!

تیرا ہر قطرہ ہے محنت کے پسینے کا وقار
تیری ہر موج میں ہے موجِ تبسّم کا نکھار
تجھ سے شاداب امنگوں کے مہکتے گلزار
تیرے دم سے ہے رگِ دشت میں کھنچِ بہار

تیری ہر لہر ہے سیرابیٔ عالم کا پیام
والگا لال سلام!

تیری گل بیز و شفق ریز روانی کی قسم
حسنِ رفتار کی، رنگین کہانی کی قسم
امن سرشاریٔ طغیانِ جوانی کی قسم
جنگ کی آگ پہ ہنستے ہوئے پانی کی قسم
ڈھانپ لینگے ترے ساحل کو گھٹا بن کے عوام
والگا لال سلام!

سنہ ۵۲ء

(انقلاب روس کی ۳۵ ویں سال گرہ پہ)

غزل

بے باک ہیں، پاداشِ خطا سے نہیں ڈرتے
ہم عشق کے مجرم ہیں، سزا سے نہیں ڈرتے

آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں صبحِ رُخِ جاناں
ہم تیرگیٔ شامِ بلا سے نہیں ڈرتے

پندارِ وفا ضامنِ بے باکیٔ دِل ہے
ہم حوصلۂ اہلِ جفا سے نہیں ڈرتے

عجزِ رسن و دار کا عالم ہے نظر میں
ہم طوق و سلاسل کی فضا سے نہیں ڈرتے

ہیں شمعِ سرِ راہ تو روشن ہی رہیں گے

ہم دامنِ رہزن کی ہوا سے نہیں ڈرتے

بارہ دیکھانے کو تو آئے ہو چمن میں
کیا ہم ہی موجِ صبا سے نہیں ڈرتے؟

کیوں گھیر رہے ہیں گل و گلزار کو شعلے
کیا ابرِ بہاراں کی سزا سے نہیں ڈرتے؟

یہ تاج کے سائے میں زر و سیم کے خرمن
کیوں آتشِ کشکولِ گدا سے نہیں ڈرتے؟

اتنا کبھی کوئی محوِ جفا میں نہیں ہوتا
تم ولولۂ اہلِ وفا سے نہیں ڈرتے؟

غاروں کی شریعت پہ ہے اب شیخ کا ایماں
مسجد میں تو جاتے ہیں خدا سے نہیں ڈرتے

سنہ ۵۴ء
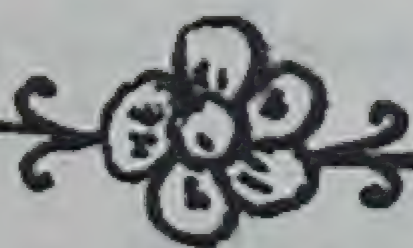
دعوت

میں اپنے ہونٹوں پہ شعلے چھپا کے جاؤں گا
ہر ایک سانس میں بجلی چھپا کے جاؤں گا
نظر کو شمعِ فروزاں بنا کے جاؤں گا
ضرور جاؤں گا اور سر اٹھا کے جاؤں گا

دیارِ دار و رسن نے مجھے بلایا ہے

کچھ اور کس لوں ربابِ ہنر کے تاروں کو
بنا لوں تیغ بکف اپنے فکر پاروں کو
زرہ پہنا لوں شفق ریز استعاروں کو
سجا لوں فوج کی صورت حسیں اشاروں کو

کہ قتل گاہِ سخن نے مجھے بلایا ہے

نہ فکرِ جیب کی باقی نہ ہوش دامن کا
یہ سیتے رہتے ہیں بس شامیانہ مدفن کا
سمجھ رہے ہیں کہ تاجِ ہوں تار و سوزن کا
ہے میتوں کو چھپانا ہی مدّعا فن کا

رفوگرانِ کفن نے مجھے بلایا ہے

بنایا جائے گا ممتاز میہماں مجھ کو
دکھائے جائیں گے الطافِ میزباں مجھ کو
سنائی جائیں گی بے کیف نالیاں مجھ کو
ملے گا کاغذی پھولوں کا ارمغاں مجھ کو

عدوئے سرو و سمن نے مجھے بلایا ہے

بساطِ عزم کے ہر گھر کو دیکھنا ہوگا
تمام نقشوں میں بہتر کو دیکھنا ہوگا
خود اپنے مہروں کے لشکر کو دیکھنا ہوگا
ہر ایک چال کو، تیور کو دیکھنا ہوگا

کہ شاطرانِ کہن نے مجھے بلایا ہے

جہانِ شوق میں رقصاں ہے آج گلناری
مرے کلام کو ہے نازِ لالہ رخساری
ہے مصرفِ فکر میں ہر وقت گرم بازاری
ہے میرے شعروں پہ اک رنگِ یوسفی طاری
فضائے گرگ دہن نے مجھے بلایا ہے

یہ امتحاں ہے مرے عزم نغمہ خوانی کا
نوائے تلخ کا، بے باک گلفشانی کا
یقین دِل کو ہے یاروں کی قدردانی کا
عوام بیڑا اٹھائے ہیں میزبانی کا
بلا سے دشمنِ فن نے مجھے بلایا ہے

۵۲ء

غزل

لو وہ بھی پوچھتے ہیں کہ "جاؤں کدھر کو" میں؟
ڈال آؤں جا کے قدموں پہ کیا رہگذر کو میں؟

اب ضامنِ رسائی منزل ہے ہر قدم
لے کر چلا ہوں ساتھ شعورِ سفر کو میں

پامال گردنوں کی بلندی کے واسطے
خوش ہو رہا ہوں لے کے ہتھیلی پہ سر کو میں

اے شدتِ فشارِ قفس! یوں گلا نہ گھونٹ
بھولا نہیں ہوں زمزمۂ بال و پر کو میں

اپنے نقوشِ پا سے زمانے کے واسطے
ترتیب دے رہا ہوں نصابِ سفر کو میں

اے رات! تیری یورشِ ظلمت کے باوجود
اونچا کیے ہوئے ہوں لوائے سحر کو میں

پردے رخِ حیات کے اب کانپتے رہیں
آواز دے چکا نگہہِ پردہ در کو میں

ہوں لشکرِ خزف میں رجز خوانِ عہدِ نو
ٹھکرا رہا ہوں سطوتِ لعل و گہر کو میں

نغمے مرے فضا میں شفق گھولتے ہیں آج
سینے میں ہوں چھپائے ہوئے کس سحر کو میں

کاشانۂ حیات پہ جھپٹیں نہ بجلیاں
چھیننے نہ دونگا رونقِ دیوار و در کو میں

ظالم کی ہر الاپ ہے پیغمبرِ حیات
بجھنے نہ دونگا اپنے دِل نغمہ گر کو میں

بکسا جیل سنہ ۵۰ء
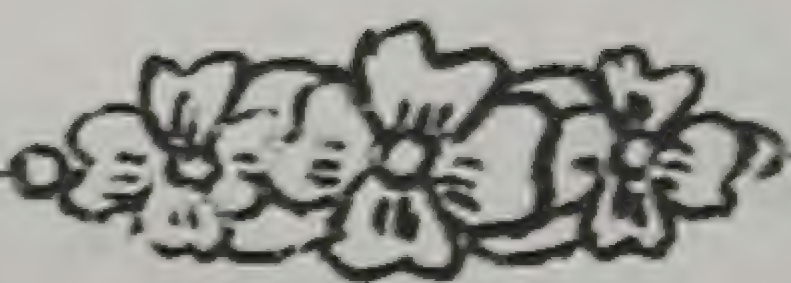
جوانی ہمارے وطن میں

ہوائے چمن نکہت افشاں نہیں ہے ہمارے وطن میں
گلوں کو میسر بہاراں نہیں ہے ہمارے وطن میں
کوئی قدرِ مرغِ خوش الحاں نہیں ہے ہمارے وطن میں
گلستاں ابھی تک گلستاں نہیں ہے ہمارے وطن میں

ہمارے وطن میں جوانوں کی آنکھیں ہیں بے نور اب تک
تمناؤں کے قافلے اپنی منزل سے ہیں دور اب تک
امنگوں کے ماتم میں سینوں کے اندر ہیں دل چور اب تک
جوانی ابھی کیف ساماں نہیں ہے ہمارے وطن میں

جواں حوصلوں کو ابھی ڈس رہے ہیں اندھیروں کے کالے
وہ کالے جو کل رات کے لاڈلوں نے شبستاں میں پالے

وہ کالے جواب زہر ڈالر کا پی کر جنے کو ڈیا لے
ابھی صبحِ نرہاق افشاں نہیں ہے ہمارے وطن میں

ابھی بھوک کی بھٹیوں میں جوانی جلی جا رہی ہے
دمکنے سے گالوں پہ غربت کی ہلدی ملی جا رہی ہے
ترقی کی ہر آرزو بے دلی میں ڈھلی جا رہی ہے
مسرت ابھی تک غزل خواں نہیں ہے ہمارے وطن میں

سبق درس گاہوں میں بے چارگی کا دیا جا رہا ہے
پلا کر شرابِ ہوس خونِ دل کا پیا جا رہا ہے
جنونِ محبت سے کارِ تجارت لیا جا رہا ہے
ابھی لطفِ چاکِ گریباں نہیں ہے ہمارے وطن میں

کتابوں کی سطریں نگاہوں کو ڈستی ہیں کیوں ناگ بن کر
دماغوں کے پردوں کو الفاظ چھوتے ہیں کیوں آگ بن کر
دلوں کی گھٹن آج منہ سے نکلتی ہے کیوں جھاگ بن کر
ابھی علم حسنِ حسیناں نہیں ہے ہمارے وطن میں

جواں لڑکیاں وقت سے پہلے بوڑھی ہوئی جا رہی ہیں

سمن زار رخسار پہ جھریوں کی تہیں چھا رہی ہیں

سہی قامتوں پر کماں پشت فوجیں چڑھی جا رہی ہیں

سر افراز سروِ خراماں نہیں ہے ہمارے وطن میں

مگر شہر و قریہ میں بیدار ہے اب شعورِ جوانی

بجھی انکھڑیوں میں چمکنے لگا ہے غرورِ جوانی

برسنے لگا ہے سیہ پوش چہروں پہ نورِ جوانی

شباب آج مجبورِ حرماں نہیں ہے ہمارے وطن میں

مسلح امنگیں دلوں سے نکل کر بکھرنے لگی ہیں

رئیسوں کے کھیتوں سے بھوکوں کی فوجیں گزرنے لگی ہیں

مشینوں کی پسی ہوئی ہڈیاں اب ابھرنے لگی ہیں

خموشی آج کوئی دبستاں نہیں ہے ہمارے وطن میں

قلم آج تلوار بننے کو بے تاب ہے دفتروں میں

شمار اب تو سانسوں کا ہونے لگا ہے یہاں خنجروں میں

چھنکے جا رہے ہیں جوانی کے غصّے سے چولھے گھروں میں
بجھا دینا شعلوں کا آساں نہیں ہے ہمارے وطن میں

شفق کے جزیروں میں پل کر رہے گا ہمارا وطن بھی
مہک کر رہے گا چمن زارِ عالم میں اپنا چمن بھی
یہ دوشیزہ بیوہ، یہ لوٹے گی جوانی بنے گی دلہن بھی
کہ اب جنبشِ پیری کا امکاں نہیں ہے ہمارے وطن میں

سنہ ۵۲ء

اِستالن

چشمِ گریاں سے دیکھتا ہوں میں آج کیا رنگِ باغِ عالم ہے

لہلہاتا ہوا حسیں سبزہ ایک تصویرِ بزمِ ماتم ہے

بُلبلوں کا سکوتِ فریادی آئینہ دارِ شدّتِ غم ہے

دل میں کُہرام ہر کلی کے ہے شورِ خاموشِ اشکِ شبنم ہے

تُربتِ باغباں پہ گلشن میں ہر نہالِ جواں کا سر خم ہے

وجہ نوحہ گری ہے استالن

اِس سے پہلے بھی باغِ دُنیا میں کتنے ہی بن کے باغباں آئے

جن کے حسنِ چمن طرازی سے لالہ و گُل نے حوصلے پائے

جن کے افکارِ گل بداماں کے رقص فرما ہیں گھنے سائے

جن کی رخصت پہ عندلیبوں نے کتنے پُر درد مرثیے گائے

اِس "چمن گیر" غم کی وسعت لے کیسے شعلے چمن میں بھڑکائے

فصلِ گُل بن گئی ہے استالن

غم نہیں ہے یہ فردِ واحد کا بلکہ کل کائنات کا غم ہے
صبح کا غم ہے، شام کا غم ہے، دِن کا غم ہے، یہ رات کا غم ہے
یہ ہتھوڑے، درانتی کا غم ہے، یہ قلم کا، دوات کا غم ہے
کھیت کا غم ہے، دھان کا غم ہے، جَو کا غم، ساگ پات کا غم ہے
عزم کا غم، ثبات کا غم ہے، کارِ زارِ حیات کا غم ہے
غم کی جانِ خوشی ہے استالن

رند کا غم ہے، نشے کا غم ہے، جام کا غم، شراب کا غم ہے
نَے کا غم ہے، ستار کا غم ہے، چنگ کا غم، رباب کا غم ہے
غم ہے طفلی کا، غم ہے پیری کا، حُسن کا غم، شباب کا غم ہے
غم جلوسوں کا، سُرخ جھنڈوں کا، جوش کا، اضطراب کا غم ہے
غم بھنچی مٹھیوں کی طاقت کا، نعرۂ انقلاب کا غم ہے
نُہ درح کی سرکشی ہے استالن

آئینہ، شانہ، سوئی کا غم ہے، کُرتے، ساڑی، کُلاہ کا غم ہے

ٹرام کا، بس کا، ریل کا غم ہے، غم ہے راہی کا، راہ کا غم ہے
ننگے جسموں کا، وردیوں کا غم، دل کا غم ہے، نگاہ کا غم ہے
غم ہے چولہے کا، غم ہے چکّی کا، فکر کی رقص گاہ کا غم ہے
غم ہے گیتوں کا، غم فسانوں کا، جاہ کا غم، تباہ کا غم ہے
شوق کی ہچکی ہے استالن

دجلہ، نیل اور فرات کا غم ہے، ٹیمز، ڈینیوب، سین کا غم ہے
غم ہے گورے کا، غم ہے کالے کا، سادہ رو کا، حسین کا غم ہے
ایشیا کے ہر ایک دل کا غم، یورپی ہر مشین کا غم ہے
گندم بو کرین کا غم ہے، اشتراکی زمین کا غم ہے
کوریا کا، ملایا کا غم ہے، ہند کا غم ہے، چین کا غم ہے
رشتۂ ہم غمی ہے استالن

کیف پرور، سرور افزا ہے، اس "غم نو" کی "عزم سرشاری"
اس کی شدت میں رقص فرما ہے، ولولوں کا فسانۂ بیداری
اس کی گہرائی میں، اُمنگوں کی ایک نہر شباب ہے جاری

اس کی وسعت میں گم ہو گئی ہے حال و آئندہ کی فسوں کاری
اس کی پہنائی سے لرزتا ہے جنگ بازوں کا دامِ مکّاری

امن ہے آشتی ہے اسٹالن

اِن کروڑوں کروڑ پلکوں پہ آنسوؤں کی جو بوندیں لرزاں ہیں
آج اِن بے شمار آنکھوں کے جو ستارے متاعِ داماں ہیں
خوں فشاں چشم ہائے عالم کے جو بہتے ہیں لعل و مرجاں ہیں
سب اُمڈتی ہوئی سی قسمیں ہیں دل کے سیّال عہد و پیماں ہیں
اِن میں اسٹالنی عزائم کے کتنے سیلاب تُند پنہاں ہیں

عزم طوفاں روی ہے اسٹالن

آج بھی کھڑکیاں کریملن کی اسی صورت سے مسکراتی ہیں
آج بھی جھوڑی جیکلی سڑکوں کو شمعیں کرنوں کی گدگداتی ہیں
اب اسٹالنی شعاعوں سے گلیاں ذہنوں کی جگمگاتی ہیں
کرنیں اسٹالنی اجالے کی اب بھی روحوں میں تھرتھراتی ہیں
اب بھی اسٹالنی خیالوں سے نظریں دنیا کی لپٹی جاتی ہیں

وقت کی روشنی ہے اسٹالن

آج ہر قومیت[1] کی آزادی روحِ تاریخ کا تقاضا ہے
فلسفہ بولیوں، زبانوں کا، ہم تک آسان ہو کے پہنچا ہے
سوویت یونین کا بنیادی اقتصادی نظام کیا ہے؟
اشتراکی سماج سے کیوں کر اشتمالی سماج بنتا ہے؟
امن کی طاقتوں کا دنیا میں دور اب کیوں ہے اور کتنا ہے؟

شرحِ پیچیدگی ہے اسٹالن

"لفظ پیکر" بنی ہے ہر دھڑکن، ہر عبارت میں دل دھڑکتا ہے
آئینے میں اک ایک جھلکے کے عارضِ زندگی دمکتا ہے
فکر و احساس کی گھلاوٹ کا رنگ ہر حرف سے جھلکتا ہے
شعلۂ گل کی طرح ہر فقرہ پردۂ ذہن پر لپکتا ہے
میکدہ ہے قلم کے سینے میں بادۂ زرفشاں چھلکتا ہے

نشۂ آگہی ہے اسٹالن

زندگی ہے مرے کتابوں میں زندگی ہے مرے اشاروں میں

[1] اِس بند میں کامریڈ اسٹالن کی ان معرکتہ الآرا تصنیفوں کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے مارکسی خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ "قومیتوں کا مسئلہ" "زبان کا مسئلہ" "سوویت یونین کے معاشی مسائل" وغیرہ۔

میری عالم فروز تشبیہیں گنی جاتی ہیں چاند تاروں میں
ہے مشقّت کی روحِ صنّاعی میرے بے باک استعاروں میں
حوصلے جتنے سہمے بیٹھے تھے دل کے تاریک تنگ غاروں میں
بن کے اشعار جگمگاتے ہیں کارخانوں میں کشت زاروں میں

اب مری شاعری کا ہے استالن

منحصر یہ نہیں مجھی پر کچھ سارے عالم نے فیض پایا ہے
صبحِ استالن کا دُنیا کے گوشے گوشے پہ نور چھایا ہے
بے زبانی نے گیت گائے ہیں پائمالی نے سر اُٹھایا ہے
کھُردری اُنگلیوں نے محنت کی سازِ پندار کا بجایا ہے
سر پہ ہر باشعور انساں کے فکرِ استالن کا سایا ہے

آج ہر آدمی ہے استالن

لاکھ ڈالر کی بین گو سُن کر چاندی سونے کے سانپ لہرائیں
"کوکا کولا" کے تیز دھاروں میں میکڈرتے جان بل کے بہ جائیں
نفع خوری کی زندگی کے لئے جنگی اڈوں کے جال پھیلائیں

لاکھ استالنی جوانوں کو اپنے ایٹم بموں سے دھمکائیں
حکم تاریخ ہے کہ آپس میں یہ لٹیرے گروہ ٹکرائیں
روح تاریخ کی ہے استالن

موت کا کون نام لیتا ہے موت آتی نہیں صداقت کو
موت کے پاؤں کانپ جاتے ہیں دیکھ کر اہل عزم و ہمت کو
جام آب حیات دیتا ہے وقت ہر عارف حقیقت کو
کاٹ سکتی نہیں کوئی قینچی روح کے رشتۂ رفاقت کو
زندگی ہی کا نام لیتا ہے دیکھو جس تشنۂ مسرت کو
آج خود زندگی ہے استالن

مارچ ۵۳ء

غزل

موت کی تجارت کو زندگی نہیں کہتے
آدمی کے دشمن کو آدمی نہیں کہتے

داغدار اجالے پر، یہ سحر نہ اترائے
برص کی سفیدی کو روشنی نہیں کہتے

ہے حیات اک شورش منزل آفرینی کی
آتی جاتی سانسوں کو زندگی نہیں کہتے

مژدۂ مسرت کیوں آپ لے کے آئے ہیں
کپکپی کو ہونٹوں کی ہم ہنسی نہیں کہتے

کیف پا نہیں سکتے ذکر صبح روشن سے
آپ تیرگی کو بھی تیرگی نہیں کہتے

آپ کا کرم ہوگا راستے سے ہٹ جانا
کارواں فریبی کو رہ...

سیف الدین سیف

حسرتِ ستائش میں خود ستائی کرتے ہو
اپنا حالِ احساسِ کمتری نہیں کہتے

چشمِ لطف کا انکی، دل فریب کیوں کھاتا
التفاتِ دشمن کو دوستی نہیں کہتے

فلسفوں کے پردے میں جہل چھپ نہیں سکتا
واہمے کی شوخی کو آگہی نہیں کہتے

چند غرقِ صہبا ہیں اور باقی سب پیاسے
ایسی بادہ خواری کو میکشی نہیں کہتے

ہے شعور کی وسعت روحِ نغمۂ شاعر
جہل کے ترنم کو شاعری نہیں کہتے

خونِ[1] ہر کبوتر کا احترام لازم ہے
تشنگیٔ شاہیں کو ہم خودی نہیں کہتے

داستانِ جور ان کی مشتہر ہے دنیا میں
وہ کبھی نہیں سنتے، ہم کبھی نہیں کہتے

سنہ ۵۳ء

[1] ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کے فلسفۂ خودی سے معذرت کے ساتھ۔

ضیافت

کل رئیسِ صوبہ کی محفلِ سیاست میں علم وفن کی دعوت تھی
مئے قلم، قلم، بربط، لحن اور پائل کی دھوم سے ضیافت تھی
پکچروں فسانوں سے، محفلی ترانوں سے کرسیوں کی زینت تھی
خوانِ پُر تکلف پر لوبہ لو پلیٹوں میں ذائقے کی جنّت تھی
صوت و رنگ مہماں تھے، کِلک و ساز مہماں تھے، میزباں حکومت تھی
فن کے ذائقے کو جب خوانِ پُر تکلف کی نعمتوں میں گُم پایا
مُنعمی کے ہونٹوں پر مُسکراہٹیں دوڑیں، آنکھ میں سُرور آیا
ہر زبان کو تولا، ہر پلیٹ کو دیکھا، دِل پہ نشّہ سا چھایا
اس قدر تکلف کیوں اور کیوں نہیں کھلتے؟" بار بار دہرایا
پیٹ بھر چکے تو کہا، ہاتھ روک لے کوئی، کس میں اتنی ہمت تھی!

رقص علم و دانش کا، چاندنی پلیٹوں پہ تھم گیا تو آقا نے
مسکرا کے فرمایا، شعر ہوں کہ تصویریں، گیت ہوں کہ افسانے
ناچ یا ڈرامے ہوں، کوئی کیبر یکچر ہو، یا ہوں فلم کے گانے
فرض منصبی ان کا آج آپ لوگوں کو میں چلا ہوں سمجھانے
آپ لوگ پوچھیں گے پہلے کیوں نہ سمجھایا، اس میں کیا سیاست تھی
کیا جواب دوں اس کا؟ معذرت طلب ہوں میں، بدگمان نہ ہو جائیں
میرے عزم کو دیکھیں، میرے کام کو دیکھیں، ان پہ غور فرمائیں
آٹھ سو سے زائد ہی ہوں گی میری اسکیمیں، نام سے نہ گھبرائیں
خود ستائی ہوتی ہے، قصہ مختصر یہ ہے، فن کو کام میں لائیں
مجھ کو آپ لوگوں سے آج بھی تعلق ہے، پہلے بھی محبت تھی
آپ لوگ اپنے ہیں، میں ہمیشہ اپنوں کو معتبر سمجھتا ہوں
اعتماد کرتا ہوں کیوں کہ آپ لوگوں کو باہنر سمجھتا ہوں
فن کو علم و دانش کو، جامۂ حکومت کا بخیہ گر سمجھتا ہوں
کام کی ہیں اسکیمیں، کام کے ہیں منصوبے۔ اس قدر سمجھتا ہوں

اِس مریض صوبے کو ایسی ہی دواؤں کی پہلے بھی ضرورت تھی
اور کتنا سمجھاؤں، آپ لوگ دانا ہیں، اہلِ علم و عرفاں ہیں
ملک و قوم کے دل ہیں، اِس غریب صوبے کے حوصلے ہیں ارماں ہیں
کچھ توجہِ فن کی منتظر ہیں اسکیمیں۔ فائلوں میں غلطاں ہیں
کام پبلسٹی کے سوچیئے تو مشکل ہیں، کیجئے تو آساں ہیں
بیوقوف جنتا تو آج بھی مُصیبت ہے، پہلے بھی مصیبت تھی
یہ گنے چُنے مہماں، پا کے بات کی تہہ کو گردنیں ہلاتے تھے
میزبان آغا کے حُسنِ گُل فشانی پر تالیاں بجاتے تھے
تالیاں بجاتے تھے، بلکہ جوش میں آکر جھوم جھوم جاتے تھے
اِن میں چند ایسے بھی اہلِ فن تھے جو طنزاً صرف مُسکراتے تھے
اِن کے مسکراہٹ میں کانپتی، لرزتی سی، تلخیٔ حقیقت تھی
اِس کے بعد تعریفیں کر سیوں پہ لہرائیں، مدح خوانیاں اُٹھیں
شکریہ ادا کرنے اپنی اپنی جگہوں سے خوش بیانیاں اُٹھیں
شرحِ مدّعا کرنے پختہ مشقیاں اُٹھیں، نکتہ دانیاں اُٹھیں

ہم زباں نشستوں سے کچھ رسیلے گیت اُٹھے، کچھ کہانیاں اُٹھیں
میزبان آقا کے عمر دیدہ چہرے پر سُرخیٔ مسرت تھی

چائے پی کے "لپٹن" کی سوکھنے نہ پائے تھے ہونٹ استعاروں کے
کیک خاص "فریڈو" کے کروٹیں بدلتے تھے منہ میں فکر پاروں کے
چاٹتے تھے لب اب تک قافلے کنایوں کے، کاروان اشاروں کے
لطف میں اضافہ تھے میٹھے میٹھے جملے بھی چند بخیہ کاروں کے
خوردہ و شنیدہ سے کچھ مٹھاس کانوں میں، منہ میں کچھ حلاوت تھی

اتنے میں بپھرے ہو کر اک جری مصور نے جیسے آگ برسا دی
عرض کی "مرے آقا! علم و فن کی قسمت میں کب ہے لطف آزادی؟
پیاری پیاری تخئیلیں بھوک سے تڑپتی ہیں، ولولے ہیں فریادی
آرٹ کیا بڑھے آگے، ہر طرف تباہی ہے، ہر طرف ہے بربادی
آج کیوں ہے بربادی، کل کی خستہ حالی تو غیر کی شرارت تھی

آپ ایسی حالت میں ہم شکستہ حالوں سے مانگتے ہیں فن پارے
جن کے گوشے گوشے سے گورے کالے منصوبے چھوٹتے ہیں بن کے فوارے

جن کی نیند میں جنوں کو دیکھ کر پلٹ جائیں وقت کے جواں دھارے

جن کے آب رنگیں میں غرق ہو کے بجھ جائیں جسم و جاں کے انگارے

آپ کی عنایت سے آجکل فسردہ ہے فن میں جو نزاکت تھی"

دیکھ کر یہ گستاخی مدح خوانیاں لرزیں، میزباں کو طیش آیا

نازِ میزبانی نے خشمگیں نگاہوں کی بجلیوں کو چمکایا

"بے محل یہ باتیں ہیں، بے محل یہ شکوے ہیں" تیز ہو کے فرمایا

"آپ جب یہاں آئیں ساتھ لائیں تصویریں جو پلٹ سکیں کایا

دل میں دفن کر ڈالیں، آج جو شکایت ہے یا جو کل شکایت تھی

اور آپ لوگوں کو آج کیوں میں زحمت دوں، شکریہ عنایت کا

یاد بس یہ رکھئے گا علم و فن کے گاندھیوں پہ قرض ہے حکومت کا

میری ساری اسکیمیں مانگتی ہیں کچھ حصہ فکر کی لطافت کا

جائیے خدا حافظ، شکریہ تعاون کا، شکریہ حمایت کا"

اس کے بعد فوراً ہی ہر نشست خالی تھی ختم کل کی صحبت تھی

محفلِ سیاست سے کچھ لرزتے نکلے تھے کچھ بپھر کے نکلے تھے

فخر خود فروشی میں بعض دھنستے نکلے تھے، بعض اُبھرتے نکلے تھے
اپنے اپنے سینوں میں بے شمار اُمیدیں چند بھرتے نکلے تھے
چند اس مصوّر کی بے پناہ جُرأت پر رشک کرتے نکلے تھے

چند کی نگاہوں میں تھی چمک مسرّت کی، چند کو ندامت تھی،

کھو کھلے ہیں منصوبے، ان سے دور جنتا کی کیا مصیبتیں ہوں گی
بھیڑ کے تلاطم میں غرق ہوں گے فن پارے غرق شہرتیں ہوں گی
زر خرید فن سے کیا، میزبان آقا کی سچّی خدمتیں ہوں گی
دعوتوں کی کیا گنتی، اور بھی یہاں ایسی کتنی دعوتیں ہوں گی

میہماں نہ بھولیں گے، میزبان حاتم تھا، میز خوبصورت تھی

~~~
~~~

غزل

پھوڑ لیں خود اپنی آنکھیں، دیدہ ور ایسے بھی ہیں
آئینے کو توڑ ڈالیں خود نگر ایسے بھی ہیں

جن کے آنسو مانگتے رہتے ہیں ہمدردی کی بھیک
مُدّعیانِ وقارِ چشمِ تر ایسے بھی ہیں

جن کا اندازِ رفاقت رہزنی کی آب رو
قافلے میں اپنے کتنے ہم سفر ایسے بھی ہیں

جن کی وحشت "فن برائے فن" کی اِک تصویر ہے
اپنی محفل میں کئی آشفتہ سر ایسے بھی ہیں

راہ میں ٹھوکر لگے تو قافلے سے روٹھ جائیں
عزت افزایانِ خاکِ رہگذر ایسے بھی ہیں

ندرتِ دشنام پر جن کی، عدو کو رشک آئے
دوستوں میں اپنے کچھ اہلِ ہنر ایسے بھی ہیں

جن کے رہنے والے پتھر پھینکتے ہیں ہر طرف
رحم کے قابل یہاں شیشے کے گھر ایسے بھی ہیں

چاند سے جن کو شکایت، جن کو سورج سے گلہ
ناقدانِ گردشِ شام و سحر ایسے بھی ہیں

آشیاں بردوش اُڑتے ہیں قفس کے آس پاس
شہرت اندوزانِ زعمِ بال و پر ایسے بھی ہیں

۱۹۵۴ء

روشنی کو ووٹ دو!

نہیں یہ بات علم کی کہ جہل ہی کو ووٹ دو
یہ انتخاب عقل ہے، نہ ابلہی کو ووٹ دو
یہ امتحانِ عزم ہے، نہ بزدلی کو ووٹ دو
نہ قاہری کو ووٹ دو، نہ ہٹلری کو ووٹ دو

یہ روشنی کا وقت ہے، نہ دشمنی کو ووٹ دو

بھری ہوئی تجوریاں تمہیں پکارتی رہیں
سفید پوش چوریاں تمہیں پکارتی رہیں
ہوس کی سینہ زوریاں تمہیں پکارتی رہیں
کہ میٹھی میٹھی لوریاں تمہیں پکارتی رہیں

مگر یہ وقتِ شب نہیں کہ تیرگی کو ووٹ دو

تمہاری بھوک سامنے ہے شدّتیں لیے ہوئے
چمکتے چاولوں کے دل میں تیز بینتیں لیے ہوئے
مسک رہے ہیں پیرہن شرافتیں لیے ہوئے
سسک رہے ہیں مدرسے جہالتیں لیے ہوئے
نہ پھنس کے دامِ مفلسی میں مفلسی کو ووٹ دو

ہزار روپ بھر رہی ہے سازشِ فرنگیاں
چھپی ہوئی ہیں مچھلیوں کی کھال میں نہنگیاں
بچھا رہی ہیں دوستی کا دام خانہ جنگیاں
فریب دے رہی ہیں پھر وہ رنگیاں "نیرنگیاں"
نہ سازشوں کو ووٹ دو نہ سازشی کو ووٹ دو

سکوتِ رنجِ مفلسی کو داستان بخش دو
تم اپنی گونگی زندگی کو اب زبان بخش دو
زبانِ زندگی کو اور فضا کو کان بخش دو
زمین کو سرخ پرچموں کا آسمان بخش دو

ربابِ وقت کی قسم ابنہ خامشی کو توڑ دو

سنی تو ہوں گی لاٹھیوں کی تم نے خوش بیانیاں

وہ رائفلوں کے زمزمے دھمکیوں کی گلفشانیاں

وہ کپتانیوں کے طنطنے ستم کی لن ترانیاں

تمہیں تو یاد بیڑیوں کی ہوں گی سب کہانیاں

یہ بات عقل کی نہیں اگر انہی کو توڑ دو

شریکِ کارواں ہو تم، اسیرِ کارواں بنو

زمیں کو اوج بخش دو، حریفِ آسماں بنو

کہو فسانہ نور کا، سحر کی داستاں بنو

لفظ بنو، دہن بنو، زباں بنو، بیاں بنو

سنو پیام روشنی کا، روشنی کو توڑ دو

چمن کی ہے کلی کلی تمہارے انتظار میں

ہیں کھیتیاں ہری بھری تمہارے انتظار میں

تجلیاں ہیں صبح کی تمہارے انتظار میں

کھڑی ہوئی ہے زندگی تمہارے انتظار میں

مطالبہ ہے زندگی کا زندگی کو ووٹ دو

۵۳ء

٭٭٭

غزل

شبِ زنداں حدِ تنویر تک آ پہنچی ہے
صبحِ نو خانۂ زنجیر تک آ پہنچی ہے

توڑتی پاؤں کی زنجیروں کو آزادیٔ شوق
سایۂ زلفِ گرہ گیر تک آ پہنچی ہے

اے ہوس! دعوتِ تخریب نہ دے انساں کو
زندگی سرحدِ تعمیر تک آ پہنچی ہے

تھی جو زندانِ خموشی میں مقید وہ بات
بڑھتے بڑھتے لبِ تقریر تک آ پہنچی ہے

بند آنکھوں میں مچلتی تھی جو رنگینیٔ خواب
اب وہ گلفامیٔ تعبیر تک آ پہنچی ہے

نیند کی طرح اُڑا جاتا ہے خود رات کا رنگ
اب نظر صبح کی تنویر تک آ پہنچی ہے

اک نئی آگ دہکتی ہے جواں سینوں میں
آنچ اب اس کی دلِ پیر تک آ پہنچی ہے

بند کر بربطِ دیرینۂ اس دامارت کا راگ
بات اب خنجر و شمشیر تک آ پہنچی ہے

گیت ہریالی کے گائیں گے سسکتے ہوئے کھیت
محنت اب غاصبِ جاگیر تک آ پہنچی ہے

راہ کیا روکے گا پیچاکِ فسونِ الہام
زندگی منزلِ تفسیر تک آ پہنچی ہے

۱۹۴۶ء

———•—•—•———

الکچی کوبوئیما کی بیوہ کے نام

اے بہن! جانتا ہوں کہ شوہر ترا الکچی¹ آج دنیا سے رخصت ہوا
ہائیڈروجن کے سفاک طوفان میں بیکنی کا سکول غرقِ آفت ہوا
ریڈیائی شعاعوں کے ہیجان سے آسماں رقص گاہِ قیامت ہوا
ایٹمی لہر کے سانپ نے ڈس لیا، ترا سرتاج نذرِ ہلاکت ہوا
سرخ خطرہ چھپا تیرے سیندور میں تھا، مانگ پر بھی گمانِ بغاوت ہوا

اے بہن! یوں اکیلی نہ آنسو بہا
ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا

تیرے شوہر کا پیشہ سیاست نہ تھا، مچھلیوں کو وہ باغی بناتا نہ تھا
جال سے مچھلیاں ہی پکڑتا تھا وہ، آہنی جال کے گیت گاتا نہ تھا

¹ جزیرہ بکینی میں ہائیڈروجن بم کے تجربے کا پہلا مچھیرا شکار

دھجیاں ہی اڑاتا تھا دامن کی وہ، کوئی پرچم ہوا میں اڑاتا نہ تھا

اپنی غربت کے ماتم سے فرصت نہ تھی، باغیانہ کبھی مسکراتا نہ تھا

صرف ظالم سمندر سے لڑتا تھا وہ، حکمرانوں پہ گولی چلاتا نہ تھا

جانتا ہوں کہ ہے کس خطا کی سزا

ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا

اے ہنسا! تیرے ہونٹوں کی مل کر شفق اپنے ہونٹوں کو رنگیں بناتا تھا وہ

تیرے رخسار سے لے کے شادابیاں اپنی آنکھوں میں گلشن کھلاتا تھا وہ

چوم کر ننھے بچوں کی پیشانیاں آرزوؤں کی محفل سجاتا تھا وہ

مچھلیاں گیت گا کر پکاتی تھی تو اور کھاتے ہوئے گنگناتا تھا وہ

جب کبھی روتی تھی تو آہ بھرتا تھا وہ، جب کبھی ہنستی تھی تو مسکراتا تھا وہ

یہ تبسم اُسی کا تبسم نہ تھا

ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا

اس تبسم میں ہے زندگی کی تڑپ، اس تبسم سے ڈرتی ہیں سلطانیاں

اِس تبسّم میں ہے امن کی آرزو، آرزو میں اُمنگوں کی طغیانیاں

لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی شوخیاں، ندیوں کی طرب خیز جولانیاں

ساگروں کے مچلتے ہوئے زمزمے، ان میں ہچکولے کھاتی جہاں بانیاں

اِس تبسّم سے شاداب آبادیاں، اِس تبسّم کی حسرت میں ویرانیاں

اِس تبسّم کا رنگین ہے سلسلا

ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا

مسکراتا ہوا یہ حسیں ایشیا، جنگ بازانِ مغرب کو بھاتا نہیں

لال سورج کے اِس بال پنے پر ذرا پیار اندھیرے کے بیٹوں کو آتا نہیں

کان و معدن پہ رہتی ہے ان کی نظر، حسن ان کے دلوں کو لبھاتا نہیں

بیچنے والوں کی سوداگری کا جنوں، ساز پر امن کے گیت گاتا نہیں

صبحِ مشرق ہنسی ہے کہاں جلوہ گر، اتنا اونچا خیال اُن کا جاتا نہیں

محوِ سازش میں ہے، یا ان کو معلوم کیا

ایشیا ایک ہے ایک ہے ایشیا

اے بہن یوں نہ رو، ہیروشیما ترا، ناگاساکی ترا لوگ بھولے نہیں

آسماں سے زمیں پہ برستی ہوئی ریڈیائی گھٹا، لوگ بھولے نہیں

پیسفک کے سکوں زار پر قہر کا یہ نیا تجربہ، لوگ بھولے نہیں

"یانکی" جنگ بازی کا تیرِ قضا کس کے آکر لگا، لوگ بھولے نہیں

لوگ بھولے نہیں موت کی جانشیں، "ڈالروں" کا ہنر لوگ بھولے نہیں

جنگ کے عہد ناموں سے کیا فائدہ؟

ایشیا ایک ہے، ایک ہے ایشیا

۵۲ء

بونس

ہائے یہ تہوار، یہ رنگینیوں کی داستاں

حسنِ موسم کی ادائیں، کارواں در کارواں

لمحے لمحے کی ہتھیلی پر کھِلے ہیں گلستاں

ہیں دلوں میں آرزوئیں یا سنہری تتلیاں

موسمِ گُل میں ہیں سہتی کیوں محنتیں جورِ خزاں

سال بھر کی شبنم افشانی کا بونس دیجئے

ہاں منافع کے بنائے کتنے پربت آپ نے

اُن پہ چاندی سے جمائی برفِ دولت آپ نے

آبشارِ زر بہائے کر کے حرفت آپ نے

قید کر لی مٹھیوں میں روحِ صنعت آپ نے

کیا دیا لیکن ہمیں انعامِ محنت آپ نے

جو بہا ماتھے سے اس پانی کا بونس دیجئے

ہم پہ کیا گزری ہے، لوہے کے دلوں سے پوچھئے

اپنی فولادی مشینوں سے، ملوں سے پوچھئے

قیمتِ گوہر نہ پتھر کی سلوں سے پوچھئے

ماہروں سے پوچھئے کیوں عاقلوں سے پوچھئے

جاہلوں کی بات ہے، ہم جاہلوں سے پوچھئے

آپ دانا ہیں تو نادانی کا بونس دیجئے

ٹھنڈے چولہے دیکھتے ہیں آج خواب آتشیں

ہے تصور میں تو دل کا پھر شباب سرمگیں

ذہن میں ہیں روٹیوں کے جلوہ ہائے دل نشیں

بھوک سے دیتی ہے لو اِک اِک عرق افشاں جبیں

پیٹ کی یہ آگ ہے وعدوں سے بجھنے کی نہیں

اپنے وعدوں کی پشیمانی کا بونس دیجیے

تا بکے پہنے پھریں اپنے پھٹے کپڑوں کو ہم

ان کے چاکوں کی ہنسی سے آنکھ ہو جاتی ہے نم

دھوپ ہو یا چاندنی، ڈستی نہیں کوئی بھی کم

جسم پامالِ ستم ہے، روح پامالِ ستم

دھجیاں دامن کی، دل کا کھول دیتی ہیں بھرم

شرم آتی ہو تو عریانی کا بونس دیجیے

برتری دیتے ہیں جو اُن کم تروں کو دیکھیے

ماؤں، بہنوں، بیویوں کو، شوہروں کو دیکھیے

گھر کی عزت جن سے ہے ان دختروں کو دیکھئے
جن پہ آنچل تک نہیں ہے اُن سروں کو دیکھئے
آیئے آکر ذرا اُجڑے گھروں کو دیکھئے
اب ہماری خانہ ویرانی کا بونس دیکھئے

ہاتھ پھیلاتے نہیں ہم کچھ گدائی کے لئے
تا بکے ترسا کریں اک ایک پائی کے لئے
یہ ہماری مانگ ہے جائز کمائی کے لئے
رو رہے ہیں جسم و جاں اپنی صفائی کیلئے
بڑھ رہے ہیں حوصلے آگے لڑائی کے لئے
جوش میں دریا ہے طغیانی کا بونس دیکھئے

آپ اگر اب تک نہ سمجھے آکے سمجھائیگا کون!
سازش آغاز کی تاریخ دہرائیگا کون؟
آئینے میں جلوۂ انجام دکھلائے گا کون؟
نزع میں ہر مایہ ہے دل اُس کا بہلائیگا کون؟

سب پوچھ لیجیے آگے چل کر حکم فرمائیگا کون؟

تاہم جہاں بان ہیں، جہاں بانی کا بوسہ لیجیے
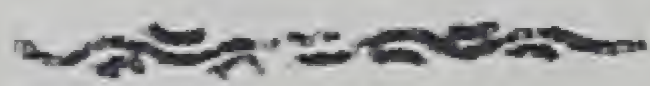
شیروانی[۱]

اے اُون کی چہیتی! اے سرج کی دلاری!
خالِ رخِ صنم کا حقا رنگ، تجھ پہ طاری
ہر تار سے نمایاں زلفوں کی رشتہ داری
چشمِ سیاہ خوباں کا نقشِ سحر کاری
ہے یاد مجھ کو تیری گذری ہوئی جوانی
اے میری شیروانی

(۱) اپنی گرم شیروانی کی بیسویں سالگرہ پر۔

تیری طلب میں دل نے کیا آفتیں اٹھائیں
سو آرزوئیں کچلیں، سو خواہشیں دبائیں
کتنی ضرورتوں کی خود دھجیاں اڑائیں
کتنے جبری تقاضوں کی گردنیں جھکائیں
کتنی "ریاضیاتی" نکیوں کی خاک چھانی
اے میری شیروانی!

کتنے "معاشیاتی" قانون میں نے توڑے
کتنے ہی "مالیاتی" پچھلے اصول چھوڑے
دوڑائے "ہندسوں" کے کاغذ پہ کتنے گھوڑے
کتنے بجٹ بنائے کتنے حساب جوڑے
کس کس کی بات ٹالی، کس کس کی بات مانی
اے میری شیروانی!

کتنے جواں ارادوں نے ہاتھ پاؤں مارے
ٹپکے مری جبیں سے کتنے حسیں ستارے

سانسوں سے میری برسے کتنے دبے شرارے
بیم و رجا کے دوزخ میں کتنے دن گذارے
جب جا کے میں نے پایا انعامِ جاں فشانی
اے میری شیروانی!

پینتیس کا دسمبر اب تک ہے یاد مجھکو
سرما کا رقصِ خنجر اب تک ہے یاد مجھکو
ٹھنڈی ہوا کا لشکر اب تک ہے یاد مجھکو
اپنا ٹھٹھرنا پیکر اب تک ہے یاد مجھکو
بھولا نہیں ہوں گرچہ ہے داستاں پرانی
اے میری شیروانی!

اس سال تو ہوئی تھی پیدا لگا کے سرما!
اے مشک رو حسینہ! عنبر عذار سرما!
سنبل سا اون تیرا تھا چندہ دار سرما!
رہتی تھی تجھ سے لپٹی شب ہائے تار سرما!
ہر صبح تھی زمستاں کی عید کامرانی

سنہ ۱۹۳۵ء

اے میری شیروانی!

یاد ہیں ہیں تجھ سے لپٹی کتنی ضیافتوں کی
کتنے مشاعروں کی کتنی صدارتوں کی
کتنی نوازشوں کی کتنی عنایتوں کی
پہلو نوازیوں کی، تپتی محبتوں کی
کتنی طرزِ مہمانی میں شانِ میزبانی
اے میری شیروانی!

کاٹے مری رفاقت میں بیس سال تو نے
جھیلا عذابِ بادِ سردِ شمال تو نے
کی میرے جسمِ لرزاں کی دیکھ بھال تو نے
رکھا ہمیشہ میرے دکھ کا خیال تو نے
لیکن بقولِ واعظ "دنیا ہے دارِ فانی"
اے میری شیروانی!

میں جیوں تجھ بِن تیرا منہ تک رہا ہوں

پھر بخیہ و رفو کا بربط بجا رہا ہوں
پچھلی نوازشوں کے پھر گیت گا رہا ہوں
ہر چاکِ نو سے تیرے آنکھیں لڑا رہا ہوں
دے سکتا کاش تجھ کو میں عمرِ جاودانی
اے میری شیروانی!

یہ سچ ہے اب رفاقت آرام چاہتی ہے
تیری مشینِ محبّت آرام چاہتی ہے
پیر و ضعیف محنت آرام چاہتی ہے
تو جیسے زیرِ تربت آرام چاہتی ہے
ہے موت کا پسینہ، ماتھے کا تیرے پانی
اے میری شیروانی!

اب تو مسک مسک کر فریاد کر رہی ہے
زخمِ رفو سے پہلو آباد کر رہی ہے
طرزِ فغاں انوکھی ایجاد کر رہی ہے

تجھ کو بھی ساتھ اپنے برباد کر رہی ہے
زاہد کے عمل سے یہ کچھ درسِ سخت جانی
اے میری اسٹیروانی!

سن لے تو سال نو کا رنگین پیام پیاری!
کرتا ہے پھر زمستاں تجھکو سلام پیاری!
امسال بھی وفا کا چمکا دے نام پیاری!
کرلوں گا پھر میں کوئی اور انتظام پیاری!
حالات مانگتے ہیں تھوڑی سی مہربانی
اے میری اسٹیروانی!

اپنی سہیلیوں کی تجھکو خبر نہیں ہے؟
ہم جولیوں کی حالت کیا خستہ تر نہیں ہے؟
کیا اُن رسیدگی کا اُن پر اثر نہیں ہے؟
لاکھوں تھیگلوں، کُرتوں پر کیا نظر نہیں ہے؟
دولت کو بے زوال سے ہے بغض خاندانی

اے میری شیروانی!

ٹھٹھرے ہوئے بدن اب نعرے لگا رہے ہیں
بوسیدہ پیرہن اب نعرے لگا رہے ہیں
یارانِ انجمن اب نعرے لگا رہے ہیں
نادار اہلِ فن اب نعرے لگا رہے ہیں
ہے چند دن کی مہماں جاڑوں کی حکمرانی
اے میری شیروانی!

۱۷ دسمبر ۱۹۵۴ء

رباعیات

کب پائیں گے جامِ مے سخنور ساقی
سوکھے ہیں ہونٹ ہوں گے کب تر ساقی
کچھ تجھ کو خبر بھی ہے کہ خونِ دل میں
لایا ہوں رباعیاں بھگو کر ساقی

کیسا ہے یہ میکدے کا منظر ساقی
کیوں آیا ہے واعظوں کا لشکر ساقی
حیرت ہے کہ برسات میں ایسے پڑتے
شیشوں پہ برس رہے ہیں پتھر ساقی

رندوں میں نہیں کوئی رقابت ساقی
ضد ہے کہ بیٹھیں گے باجماعت ساقی
کیا ظلم ہے محتسب کے بہکانے پہ
اس کو بھی سمجھ لیا سیاست ساقی

پیمانۂ کیفیت دیدہ و دل بدلا
رندوں کا خیالِ راہ منزل بدلا
ساقی! ساقی!! نئے کدے سے ساقی!!!
بدلا، بدلا، مذاقِ محفل بدلا

دہکا، دہکا، خوشی سے چہرہ دہکا
بہکا، بہکا، پھر آج موسم بہکا
ٹوٹا، ٹوٹا، سکوتِ مینا ٹوٹا
چھلکا، چھلکا، پھر رگوں میں چھلکا

ذرّوں میں چھپے ہیں ماہ پارے ساقی
ہیں خاک میں روشنی کے دھارے ساقی
رندوں کو چھڑک پینے دے مے کی بوندیں
نکلیں گے زمیں سے ستارے ساقی

آنکھوں میں فروغ انجمن ہے ساقی
چہرے پہ کھلا ہوا چمن ہے ساقی
مے کی موجوں میں شان ہے سہرے کی
اِس وقت تو زندگی دُلہن ہے ساقی

ظُلمت کا طلسم توڑ کر لایا ہوں
پنجہ شب کا مروڑ کر لایا ہوں
اے صبح کا نور پینے والو! دوڑو
تاروں کا لہو نچوڑ کر لایا ہوں

چھوٹیں چھوٹیں ستم کی نبضیں چھوٹیں
ٹوٹیں ٹوٹیں رگیں ہوس کی ٹوٹیں
کانپیں کانپیں بلا کی راتیں کانپیں
پھوٹیں پھوٹیں وہ خم سے کرنیں پھوٹیں

سنکیں سنکیں ہوس کے پالے سنکیں
ٹھنکیں ٹھنکیں بلا سے ماتھے ٹھنکیں
برسیں برسیں ہزار پتھر برسیں
کھنکیں کھنکیں کچھ اور شیشے کھنکیں

ہونٹوں کو خوشی کا راگ دینا ساقی
بہتی ہوئی سرخ آگ دینا ساقی
دنیا ہے جواں مانگ رہی سیندور
دینا ساقی سہاگ دینا ساقی

کچھ نکتۂ رازِ کیف و کم مجھ سے سن
کچھ فلسفۂ نشاط و غم مجھ سے سن
مجبورِ سکوت ہیں رہا ہوں برسوں
دولت کی حکایت ستم مجھ سے سن

دِل ہی کی طرح منہ بھی ہے کالا دیکھو
اِس پر غازے کا یہ اُجالا دیکھو
بستر ہی پہ سر ٹیک رہی ہے ظالم
دم توڑتی دولت کا سنبھالا دیکھو

سیلابِ بلا رقص نہ فرمائے کہیں
سرکش طوفان نہ بڑھ کے ٹکرائے کہیں
ساحل کا طواف کرنے والو ہشیار
ساحل پہ بھی دریا ہی نہ چھا جائے کہیں

بے ہودہ قدامتیں لئے بیٹھے ہو
فرسودہ شریعتیں لئے بیٹھے ہو
ہے آج نئے نظامِ عالم کی تلاش
تم کل کی روایتیں لئے بیٹھے ہو

انکار کی جراتوں کو ٹکرانے دو
آپس ہی میں جدتوں کو ٹکرانے دو
ٹکراؤ سے اعتدال پیدا ہوگا
ٹکرانے دو شدتوں کو ٹکرانے دو

ہر پتے میں اک دھار لیے چٹکیں گے
ہر سانس میں تلوار لیے چٹکیں گے
ڈھلکے ہوئے فولاد کے ہیں ہم غنچے
چٹکیں گے تو جھنکار لیے چٹکیں گے

ہر موج ہوا کے ساتھ لہرائیں گے
ہر شوخ گھٹا کے ساتھ بل کھائیں گے
ہر ذرۂ گلشن ہیں ہمارے نغمے
کاندھوں پہ قفس کو لے کے اُڑ جائیں گے

(بکسا اسپیشل جیل سنہ ۵۰ء)

سن سکتے ہو نغمہ آج بھی تم میرا
زنداں میں بھی باقی ہے ترنم میرا
لاکھوں ہونٹوں کی تازگی ہے اس میں
کمھلا ہی نہیں سکتا تبسّم میرا

(پریسیڈنسی جیل سنہ ۴۹ء)

زنجیر کا لوہا بھی پگھل جائے گا
شمشیر ہی کے سانچے میں ڈھل جائیگا
شعلے دلِ باغی کے بڑے سرکش ہیں
جو سامنے آئے گا وہ جل جائے گا

(بکسا اسپیشل جیل سنہ ۵۰ء)

ٹھوکر سے مشقّت کی زمینیں جاگیں
انگڑائی ہلوں نے لی، مشینیں جاگیں
جو سونے کی چھپرکھٹ پہ پڑی سوتی تھیں
جاگیں وہ گھر ریز جبینیں جاگیں

(پریسیڈنسی جیل کلکتہ سنہ ۴۹ء)

سہمے سہمے دلوں میں ہمّت جاگی
غیرت نے جھنجوڑا تو مشقّت جاگی
محکومی کی نیند کا شکنجہ ٹوٹا
وہ دیکھو کھیتی پہ، وہ بغاوت جاگی

(بکسا اسپیشل جیل سنہ ۵۰ء)

سیاروں میں حاصل ہے وہ عظمت تجھکو
کرتی ہے سلام جھک کے رفعت تجھکو
لے ہاتھ میں اے زمین پرچم اپنا
کرنی ہے ستاروں کی قیادت تجھکو

تخئیل کو گل فروش ہو جانے دو
سانسوں کو چمن بدوش ہو جانے دو
آجائے گی چہرۂ زمیں پر سرخی
افکار کو سرخ پوش ہو جانے دو

بلبل کی زبان تک جلا ڈالی ہے
مسموم ہوائے گل بنا ڈالی ہے
ان آگ کے تاجروں نے اے ابرِ بہار
گلشن میں بھی بارود بچھا ڈالی ہے

بارش میں کب آگ سر اٹھا سکتی ہے
کب موت حیات کو دبا سکتی ہے
اے امن کے گیتوں کی گھٹاؤ برسو
بارود کا کیا ہے، بھیگ جا سکتی ہے

(۲)

کھلونے

ترے چاند سورج، ستاروں سے کھیلا
میں کتنے حسیں استعاروں سے کھیلا
تصوّر سے کھیلا، نظاروں سے کھیلا
محبّت کے دونوں سہاروں سے کھیلا
تلاطم میں اکثر پڑی کشتیٔ دل
نگاہوں کے بے رحم دھاروں سے کھیلا

میں ہر سانس میں اپنی مضراب لے کر
رباب حقیقت کے تاروں سے کھیلا
بچھا کر فضاؤں میں دامِ تفکّر
میں فطرت کے مبہم اشاروں سے کھیلا
چمن کی نقابِ تسلسل اُلٹ کر
"خزاؤں" سے کھیلا، بہاروں سے کھیلا

(نوٹ:- خزاں کی جمع نہیں لکھی جاتی لیکن میں اسے صحیح سمجھتا ہوں)

لئے ہاتھ میں سازِ روحِ گلستاں
ہیں پھولوں سے، پتّوں سے، خاروں سے کھیلا

لئے اپنی سانسوں میں اِک سیلِ نغمہ
سُریلے مدھر آبشاروں سے کھیلا

اِک اِک گام پر حُسنِ لغزش دکھا کر
رہِ شوق کے پختہ کاروں سے کھیلا

ہوائیں اُڑاتا نگاہوں کا دامن
فضا کے سُلگتے نظاروں سے کھیلا

لئے رو میں اشکوں کی اجڑا ہُوا دِل
ترے غم کے سرمایہ داروں سے کھیلا

حسیں انکھڑیوں میں تبسّم اچھالے
تمنّا کے پروردِگاروں سے کھیلا

دکھایا کیا شوق ہمّتِ نظر کی
نہ کی دِل نے پروا شکست و ظفر کی

سنہ ۳۷ء

غزل

وہ تجلیاں جو سنور رہی تھیں نگار خانۂ راز میں
جو حقیقتوں پہ نظر پڑی، اتر آئیں بزمِ مجاز میں

کبھی غرقِ خوفِ نشیب میں کبھی محوِ شوقِ فراز میں
مری عقل کو نہ سکوں ملا کبھی عالمِ تگ و تاز میں

گئی حسن و عشق کی آبرو اسی جنگِ راز و نیاز میں
وہ حقیقتوں میں ہیں ہم بخود میں تڑپ رہا ہوں مجاز میں

ہو فضائے بزم میں منتشر، پناہ پردۂ ساز میں
ہوں وہ نغمہ جو ابھی پل رہا ہے ضمیرِ مطربِ راز میں

یہ حضورِ قلب کا فلسفہ کوئی جا کے شیخ سے پوچھتا
کہ حرم تو بن گیا بتکدہ ہیں جناب محوِ نماز میں

ہے نگاہِ عشق کی روشنی سے بہارِ جلوۂ دلبری
کہ سوادِ دیدۂ غزنوی کی چمک ہے خالِ ایاز میں

سنہ ۳۶ء

اِنتظارِ نامہ بر

مر رہا ہوں، نامۂ بہجت اثر کو کیا ہوا؟
نامہ بر آیا نہیں کیوں؟ نامہ بر کو کیا ہوا؟

ڈھونڈتی ہے جس کی پروازِ ہمایوں کو نگاہ
ہائے اِس مُرغِ طرب کے بال و پر کو کیا ہُوا؟

کشورِ شب میں بنے ہر نقشِ پا جس کا چراغ
اِس سفیرِ دائیِ مُلکِ سحر کو کیا ہوا؟

دِل میں انگارے جو بھر دے گرمیِ پیغام سے
اے خُدا اِس آتشیں پیغام بر کو کیا ہُوا؟

آتش کاغذ سے جس کی انگلیاں دیتی ہوں لَو
اس آمینِ دولتِ برق و شرر کو کیا ہُوا؟

مُنہ چھپائے دیکھکر جس کو سپاہِ رنج و غم
دوست کے اِس صاحبِ تیغ و کمر کو کیا ہُوا؟

مصحفِ مکتوبِ جاناں لائے جو دل کے لئے
اے محبّت اس رسولِ مُنتظر کو کیا ہُوا؟

سُن رہا ہوں ہر نفس میں آج آوازِ شکست
بارگاہِ دوست کے پیکِ ظفر کو کیا ہُوا؟

بند ہو مُٹھی میں جس کی دولتِ آبِ حیات
چشمۂ چشمِ کرم کے اِس خضر کو کیا ہُوا؟

جس کی پشتِ دست تک پہنچے یدِ بیضا کی چھوٹ
اِس کلیم و صادقِ معجز اثر کو کیا ہُوا؟

جسکی ہر جُنبش میں جھلکے ایک نقشِ التفات
اے خُدا اِس کلکِ نازِ نقش گر کو کیا ہُوا؟

جو کھلا کرتے کھفے پی کر نرگسی آنکھوں کی اوس
ہائے اِن الفاظ کے گلہائے تر کو کیا ہُوا؟

اشکِ چشمِ ناز جھلکے جس کی اِک اِک سطر سے

ہائے اس مکتوبِ لبریزِ اثر کو کیا ہوا؟

اب سہا جاتا نہیں پرویز رنجِ انتظار

نامہ بر کو کیا ہوا؟ اُف نامہ بر کو کیا ہوا؟

سنہ ۱۹ء

غزل

ہے ضبطِ گریہ، وجہِ اضطرابِ مستقل دل میں
تماشا ہے کہ دریا پرورش پاتا ہے ساحل میں

محبّت کا جنوں اور وہ بھی اس دنیائے باطل میں
گہر کی جستجو میں کر رہا ہوں ریگِ ساحل میں

جوانی، وہ بھی غربت کی جوانی، ہائے کیا کہیے
کسی نے بھر دیا پگھلا کے سونا چشمِ سائل میں

بڑا دھوکا دیا ہے رشیدؔ نے شیریں نوائی سے
کہ سب کہتے ہیں اس کو کامیابِ عشق محفل میں

سنہ [illegible]ء

محرّکات
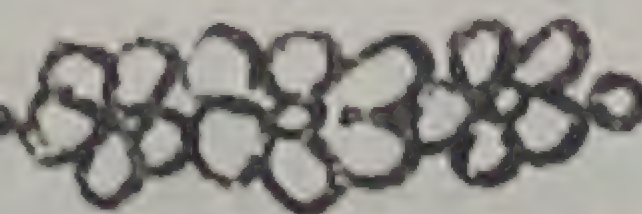
تازگیٔ یاسمین و نسترن لایا ہوں میں
روحِ شادابیٔ نسرین و سمن لایا ہوں میں
لالہ و گل کا سکوتِ نغمہ فن لایا ہوں میں
سرخوشیٔ طائرانِ نعرہ زن لایا ہوں میں
یعنی ساری دولتِ صحنِ چمن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اک انجمن لایا ہوں میں

جن کی رنگینی سے تخئیلیں مری گلفام ہیں
لالہ رنگ الفاظ ہیں، فقرے سمن اندام ہیں
جو امینِ جلوہ ہائے گلشنِ الہام ہیں
جو خدائے رنگ و بو کا آتشیں انعام ہیں
دل میں وہ جذباتِ رنگیں پیرہن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اک انجمن لایا ہوں میں

جس کے شعلوں پر گری پڑتی ہے فکرِ بے قرار
استعارے جس پہ صدقے جس پہ تشبیہیں نثار
جس کی لَو پر ناچتی ہیں صنعتیں پروانہ وار
جس کے تارِ اشک پر شاعر بجاتا ہے ستار

ذہن میں اپنے وہ شمع ضو فگن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اک انجمن لایا ہوں میں

جگمگا اٹھتی ہے جس سے خلوتِ تحت الشعور
تیرگیٔ غیب جس سے خندۂ صبحِ ظہور
چہرۂ ادراک پر جس سے جھلکتا ہے غرور
پاؤں جس کے چومتا ہے دیدۂ عرفاں کا نور

وہ شعاعِ دانشِ ظلمت شکن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اک انجمن لایا ہوں میں

نظم پیکر جس میں بنتے ہیں پریشاں تجربے
شاعرانہ زندگی کے نغمہ افشاں تجربے

جس میں ہم آہنگ ہوتے ہیں غزلخواں تجربے
جس کے اک اک پیچ میں رہتے ہیں رقصاں تجربے

اپنی سانسوں میں وہ زلفوں کی رسن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اک انجمن لایا ہوں میں

جگمگاتے خال و خد کی جس میں تابانی بھی ہے
شبنمی آنکھوں کی روحِ نغمہ افشانی بھی ہے
لذّتِ گریہ بھی، لطفِ خندہ سامانی بھی ہے
جس کی اک اک موجِ رقصاں آگ بھی پانی بھی ہے

ساغرِ دل میں وہ صہبائے سخن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اک انجمن لایا ہوں میں

دِل میں اک ناسور تھا، پہلی محبّت کی قسم
سینۂ ویراں میں وہ تنہا تھا غربت کی قسم
بے کسی کھائی تھی اس کے رنجِ عزلت کی قسم
لیکن اس بخشی ہوئی تازہ جراحت کی قسم

مونسِ تنہائی زخمِ کہن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اِک انجمن لایا ہوں میں

زندگی کی تلخیوں کا منہ چڑانے کے لئے
دلِ شکن مایوسیوں کا جی بہلانے کے لئے
سخت حال بے کیفیوں کے سر اُڑانے کے لئے
ناسازگار وقت کی میّت سنبھالنے کے لئے

بہرۂ افکار میں تیغ و کفن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اِک انجمن لایا ہوں میں

شکریہ اے مالکِ حُسنِ غزلخواں شکریہ
شکریہ اے جنتِ فکرِ سخنداں شکریہ
شکریہ اے جام بخشِ شوقِ عریاں شکریہ
شکریہ اے صاحبِ زلفِ پریشاں شکریہ

شاعری کا اِک حسین دیوانہ پن لایا ہوں میں
انجمن سے آپ کی اِک انجمن لایا ہوں میں

----★★★----

غزل

اگر گناہ یہی ہے کہ تجھ کو پیار کیا
تو ہاں گناہ کیا، اور بار بار کیا

تری طرف سے تصور نے جب کئے وعدے
خدا گواہ ترا میں نے انتظار کیا

فضا کے دام گہِ حسن و عشق ارے توبہ!
کبھی شکار ہوئے اور کبھی شکار کیا

وہ میرا گریۂ پیہم، وہ تیرا خندۂ ناز
ترے سکوں نے بہت مجھ کو بے قرار کیا

وہ حسنِ وعدہ جو آئے کبھی انتظار کے بعد
تو میں نے ہوش میں آنے کا انتظار کیا

زباں شریکِ عنایت نہ تھی تو خیر نہ ہو
تری نگاہ نے تو میرے دل کو پیار کیا

ترے کلام سے پڑ پڑ تجھا نکلتے ہیں وہ
عجیب طرزِ سخن تو نے اختیار کیا

سنہ ۱۹۳۶ء

بخششیں

سیلابِ توقع بخش گئیں، طوفانِ تمنّا بخش گئیں
ہر قطرۂ خونِ دِل کو مرے، تم شورشِ دریا بخش گئیں

ہیجانِ محبت بخش گئیں، وجدانِ تمنّا بخش گئیں
تم آنکھوں ہی آنکھوں میں دل کو، کیا جانیے کیا کیا بخش گئیں

چبھتی سی نظر کی رنگینی پیغامِ خلش کچھ دے ہی گئی
رشک آتا ہے جس پر پھولوں کو، تم دل کو وہ کانٹا بخش گئیں

دامانِ نظارہ خالی ہی جبکا نہیں رہتا جلووں سے
تم آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ کو وہ چشمِ تماشا بخش گئیں

یک لخت سکوں برباد ہوا، اک میٹھا سا درد آباد ہوا
دنیا مرے دِل کی کیا لوٹی، دِل کو مرے دنیا بخش گئیں

قسمت کے اندھیرے لرزاں ہیں، دیواروں پہ تارے رقصاں ہیں
یعنی میرے ظلمت خانے کو تم آکے اُجالا بخش گئیں

کاشانے کی رونق کیا کہئے، ایمن کی فضا شرماتی ہے
دیوار کے اک اک روزن کو تم دیدۂ موسیٰ بخش گئیں

سائے میں گھنیری زلفوں کے تم نے مجھے آخر لے ہی لیا
جینے کا سہارا کوئی نہ تھا، جینے کا سہارا بخش گئیں

چنگیزیٔ دوراں کانپ اٹھی جب اپنی نظر سے تم مجھ کو
اک عزمِ بغاوت بخش گئیں، اک شوقِ توانا بخش گئیں

اب سیلِ بلا سے کون ڈرے جب مجھ کو مرے نزدیک آ کے
طوفان کی ہمت بخش گئیں، پتھر کا کلیجا بخش گئیں

خاکِ کفِ پائے نازک اب ٹکرانے لگی ہے تاروں سے
یعنی مرے گھر کی چوکھٹ کو تم اوجِ ثریا بخش گئیں

محسوس تو کرتی ہو گی تم، مانا کہ زباں سے کچھ نہ کہو
پرویز کا کیا کیا لوٹ لیا، پرویز کو کیا کیا بخش گئیں

۱۹۴۳ء

غزل
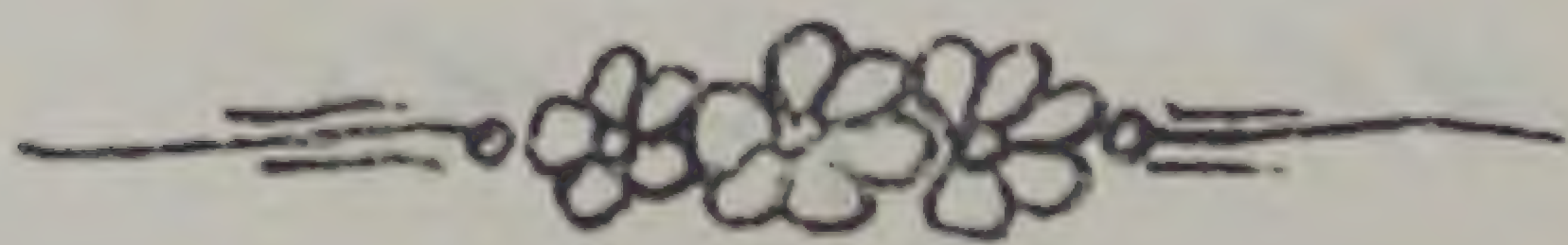
نہ جانے کہہ گئے کیا آپ مسکرانے میں
ہے دل کو ناز کہ جان آگئی فسانے میں

نہ آسکی کوئی شے تیری یاد پر غالب
تجھی سے لوں گا مدد اب تجھے بھلانے میں

نہ جانے بنتی ہے سجدوں کی داستاں کیونکر
کشش جبیں میں ہے یا تیرے آستانے میں

خبر بھی ہے تجھے کس کس نظر کی بے تابی
ہوئی ہے صرف تبسم ترا بنانے میں

ہے بھول جانے کی کوشش بھی یاد کا اک نام
میں کامیاب کہاں ہوں تجھے بھلانے میں

تیرے ہی ذوقِ کرم کے یہ کام آئیں گی

ادائیں صرف نہ کر میرے آزمانے میں

خزاں سے مانگوں گا اب داغِ دِل کی شادابی

بہارِ باغ تو ہے محوِ گُل کھلانے میں

معاف کر کبھی بہرو بیز کو نہ اے غمِ دوست!

کہ رہ دیا ہے یہ اکثر غزل سُنانے میں

سنہ ء

غزل
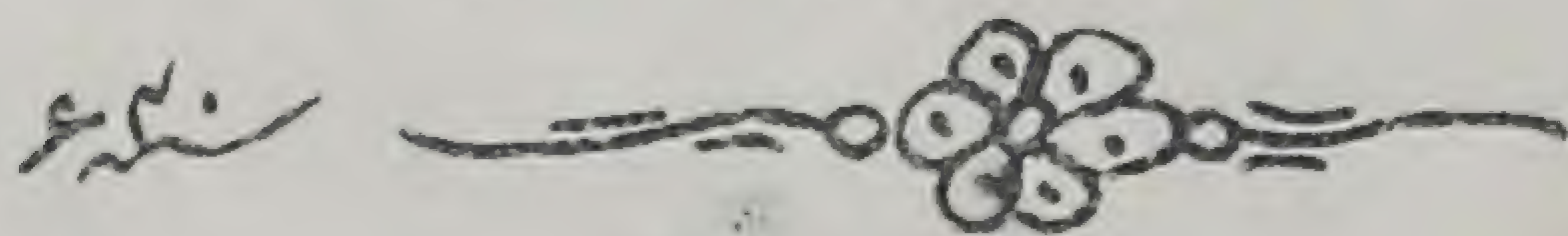
فن آج رنگِ شام و سحر پا رہا ہوں
بدلی ہوئی کسی کی نظر پا رہا ہوں میں

اب لطفِ ارتقائے نظر پا رہا ہوں میں
جلووں کو بھی شریکِ سفر پا رہا ہوں میں

ہر شعر پہ خراجِ نظر پا رہا ہوں میں
وہ ہیں خموش داد مگر پا رہا ہوں میں

آئینے ہی کے حسن میں کھوئے ہوئے ہیں سب
اس میں بھی حسنِ آئینہ گر پا رہا ہوں میں

پامالیِ جبینِ حسنِ پشیماں کا یہ نہ ہو
دامن کو ماہ تاب کے تر پا رہا ہوں میں

گزرا ہے کون پھول کھلاتا خرام سے
شاداب آج راہ گزر پا رہا ہوں میں

اے عشق! آج سرخیِ رخسارِ دوست میں
اپنا ہی رنگِ خونِ جگر پا رہا ہوں میں

وہ آ کے دے گئے ہیں مجھے دولتِ بہار
ڈوبا ہوا سرور میں گھر پا رہا ہوں میں

لپٹی ہوئی ہے فکر ترے غم کی چھاؤں میں
زانوئے دل پہ ذہن کا سر پا رہا ہوں میں

شرمندگی یا ہے ذہن کو بھی دِل کی آنچ نے
روشن جہانِ فکر و نظر پا رہا ہوں میں

ان کی نظر بھی ساتھ مرے معرکوں میں ہے
اب زندگی کو سینہ سپر پا رہا ہوں میں

اے طائرِ نگاہ! یہ تیرے ہی تو نہیں؟
کچھ عرش پہ گرے ہوئے پر پا رہا ہوں میں

سلیم عمر

تحقیر تحفہ

مانا کہ ہیں سونے سے لکھے جانے کے قابل
پرویز کے اشعار مگر زر تو نہیں ہیں

وہ ہوں فلک علم کے اک نیّر تاباں
دولت ہیں مگر میرے برابر تو نہیں ہیں

وہ فکر میں ہوں رشک ارسطو بھی تو کیا ہے
اعزاز میں ہم چشم سکندر تو نہیں ہیں

کرتے ہیں وہ تقدیر کا ماتم بہت اچھا
پر نغمہ گر اوج مقدر تو نہیں ہیں

موتی سے بھی کچھ بڑھ کے سہی آب میں اشعار
قیمت میں مگر موتی سے بڑھکر تو نہیں ہیں

مرعوب ہو کیوں حسن مرا انکی نظر سے!
اِک اچھے سے شاعر ہیں وہ افسر تو نہیں ہیں

کیا آئے ہو دینے مجھے پروین کے تحفے
اشعار ہی اشعار ہیں زیور تو نہیں ہیں

سنہ ء
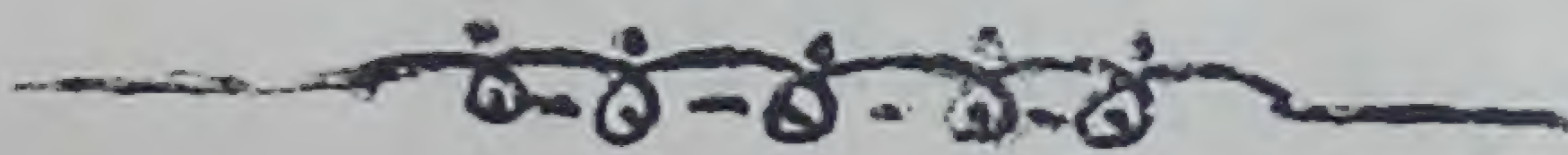
غزل

دل بڑھا تھا گردشِ چشمِ عنایت دیکھکر
ہو گیا میں چُپ تمنّاؤں کی کثرت دیکھکر

سوچ میں تھا باغباں پھولوں کی کثرت دیکھکر
ہنس دیا آخر مرے دامن کی وسعت دیکھکر

ہر قدم پر "عقل" کے کانٹے چبھ گئے پاؤں میں
دیکھکر اے مردِ میدانِ محبّت دیکھکر

حسنِ خود بیں نے بھی آخر پھینک دی اپنی نقاب
شوق کو میرے پرکھ کر میری ہمت دیکھکر

ان کے جلوے ماتمِ ذوقِ نظر کرنے لگے
انجمن کی انجمن کو محوِ حیرت دیکھکر

تیرے دیوانے ابھی تک ہنس رہے ہیں طنز سے
فلسفی کا ذوقِ تشریحِ محبّت دیکھ کر

لطفِ آزادیٔ مسلّم پھر بھی کیا اِس کا علاج
دِل کھنچا جاتا ہے خود دامِ محبّت دیکھ کر

نغمہ زن بہرِ تیر ہوں تلخیٔ غم کے باوجود
بزم میں شیریں نوائی کی ضرورت دیکھ کر

سنہ ۳۸ء

اندھیرے اُجالے

میری محبوبہ! تجھے چشمِ بصیرت کی قسم
دیکھ للچائی نگاہوں سے نہ ایوانوں کو

اہلِ پندار کی بہکی ہوئی ثروت کی قسم
بے وقوفی کی بسائی ہوئی جنت کی قسم
جلوہ فرمائی، احساسِ امارت کی قسم
روشن ایوان بھی تاریک ہیں ظلمت کی قسم

تجھ کو اے دوست ترے حسن کی غیرت کی قسم
دیکھ للچائی نگاہوں سے نہ ایوانوں کو

میں نے راحت میں بھی اندوہ کے پہلو دیکھے
قہقہوں سے بھی ٹپکتے ہوئے آنسو دیکھے
سرمگیں پلکوں سے جھڑتے ہوئے جگنو دیکھے
چوکڑی بھولے ہوئے آنکھوں کے آہو دیکھے

اپنی نظروں کی طرب خیز شرارت کی قسم
دیکھ للچائی نگاہوں سے نہ ایوانوں کو

قیمتی صوفوں پہ بھی جلوۂ غم پایا ہے
ریشمی پردوں کو بھی اشکوں سے نم پایا ہے
میں نے قالینوں کو پامالِ ستم پایا ہے
ہر طرف کرب ہی کا نقشِ قدم پایا ہے

اپنی شاداب مہکتی ہوئی خلوت کی قسم
دیکھ للچائی نگاہوں سے نہ ایوانوں کو

میں نے بجلی کے چراغوں کا دھواں بھی دیکھا
نور کے ہاتھ میں ظلمت کا نشاں بھی دیکھا

تیرگی کتنے ہی جس کو وہ سماں کبھی دیکھا
مجھ پہ بیتی ہیں جو اندھیر انھیں یہاں کبھی دیکھا

روشنی ہیں جو چھپی ہے اسی ظلمت کی قسم
دیکھ للچائی نگاہوں سے نہ ایوانوں کو

راتیں گزری ہیں مری ایسے کبھی مہ پاروں میں
چاند سورج جو لئے رہتے ہیں رخساروں میں
ان کو بھی میں نے گھرایا ہے نگاروں میں
شعلوں کی دیکھی ہیں انگڑائیاں دیواروں میں

تجھ کو اپنے رخِ تاباں کی جلالت کی قسم
دیکھ للچائی نگاہوں سے نہ ایوانوں کو

جگمگاتے ہوئے کمروں کے نظاروں پہ نہ جا
مسکراتی ہوئی شمعوں کے اشاروں پہ نہ جا
گملوں کے پھولوں کی مغرور بہاروں پہ نہ جا

سازِ بیدار کے بجتے ہوئے تاروں پہ نہ جا
بر لبِ نازک کے نغماتِ لطافت کی قسم
دیکھ للچائی نگاہوں سے نہ ایوانوں کو

حسن کے دل میں تصنّع کی تمنّا کیوں ہو
جستجوئی تہذیب کا جلوہ ہوس افزا کیوں ہو
تیرگی کے لئے بے تاب اُجالا کیوں ہو
تجھکو ہے مجھ سے محبّت تو پھر ایسا کیوں ہو
میری محبوبہ تجھے میری محبّت کی قسم
دیکھ للچائی نگاہوں سے نہ ایوانوں کو

۱۹۴۲ء

غزل

عجب طرح کی دکھائی سبک روی میں نے
جنوں کے جوش میں منزل ہی چھوڑ دی میں نے

دیا ہے رنج کو پیراہنِ خوشی میں نے
نشاطِ غم میں گزاری ہے زندگی میں نے

تصوّرات سے تشکیلِ حسن کرتا ہوں
صنم پرستی میں سیکھی ہے بت گری میں نے

غرورِ حسن تھا دریوزہ گر نگاہوں کا
تمھارے جلووں کی دیکھی تھی بیکسی میں نے

نمودِ حسن ہیں یہ شعریت خدا کی پناہ
نثارؔ آپ کی اپنی شاعری میں نے

وقارِ دیر بڑھا اجتماعِ ہمت سے

بتوں نے کی ہے خدائی پیمبری میں نے

بجا ہے گر مرے ایماں پہ کفر ناز کرے

حرم میں سیکھے ہیں آدابِ کافری میں نے

خدا بھلا کرے آنکھوں کی مسکراہٹ کا

کہ دیکھ لی تیرے جلووں کی گدگدی میں نے

مرے زوال پہ ہنستے ہیں خلد والے کیوں

بنا دیا تھا فرشتوں کو آدمی میں نے

تمام پھیلی حلاوت کلامِ شیریں کی

دکھائی نظم میں پرویز خسروی میں نے

سنہ ۳۴ء
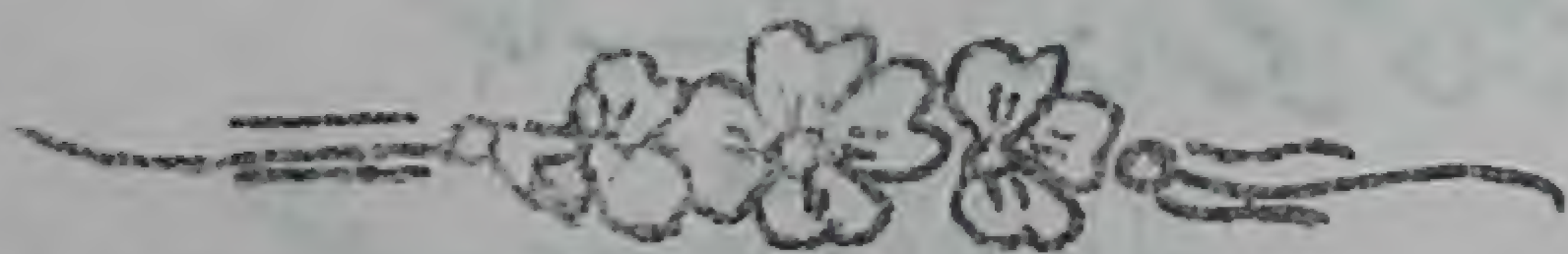
شکست

ہوں خرد کے دور میں بھی میں پریشاں آج تک
ہے وہی سر میں جنونِ زُلفِ پیچاں آج تک

فرصتِ عزلت گزینی ڈھونڈھتا ہے ذوقِ فکر
پھر بھی ہے دِل میں وہی شوقِ بیاباں آج تک

عقل ہے ہر چند مصروفِ رفوئے پیرہن
چاک ہو جاتا ہے اس پر بھی گریباں آج تک

گرچہ پورے اوج پر ہیں تجزیہ کی قوتیں
حسن کر دیتا ہے پھر بھی مجھ کو حیراں آج تک

آنسوؤں پر خندہ زن ہر چند ہے ذہنِ رسا
پھر بھی ہو جاتی ہیں آنکھیں اشک افشاں آج تک

گو سمجھ میں آچکا ہے رنگ و بو کا فلسفہ
پھر بھی ہو جاتا ہوں میں محوِ گلستاں آج تک

منزلِ تعبیر میں ہر چند ہے پائے خیال
دیکھتا ہوں پھر بھی میں خوابِ پریشاں آج تک

فکر کی سنجیدگی ہر چند ہے دل کا جواب
داغ ہو جاتے ہیں اس پر بھی نمایاں آج تک

گرچہ میں نے بند کر دی ہے بتوں پر دل کی راہ
ہے یہاں پھر بھی کوئی کافر خراماں آج تک

باوجودِ پختگئ دانشِ خلوت پسند،
دِل ہے مغلوبِ جنونِ فتنہ ساماں آج تک

ہائے باوصفِ غرورِ حکمت و نازِ شعور
اپنے دل کو میں نظر آتا ہوں ناداں آج تک

ہائے اس ادراکِ علم آوردہ کے ہوتی ہوئی
چشمِ حیرت ہے مری آئینہ ساماں آج تک
وائے بر ایں شانۂ فکرِ بلندِ موشگاف
زندگی زلفوں کی صورت ہی پریشاں آج تک
اے غرورِ فکر! رو، اے نازِ عقل، آنسو بہا!
ہنس رہا ہے تجھ پہ شوقِ چاکِ داماں آج تک
اے متانت کر فغاں، سر پیٹ اے سنجیدگی!
شوخ ہے میری نگاہِ شوق ساماں آج تک
اے غرورِ تمکنت! مٹ، پھوڑ لے سر اے وقار!
خم کیے دیتا ہے گردن پائے جاناں آج تک
دور ہو اے چشمِ بینا، دور ہو اے روشنی!
ہے وہی تاریکیوں کا ایک طوفاں آج تک

اے چراغِ فہم! بجھ جا، گُل بھی ہو اے شمعِ فکر
ہے فضائے زندگی عکسِ شبستاں آج تک

ہاں پگھل اے برفِ دانش، اے حجابِ یخ ہو دُور
تیرے نیچے تپ رہا ہے اِک بیاباں آج تک

ہاں ٹھہر جا میں بھی تیرے ساتھ ہوں گا گامزن،
تو مری رہبر ہے اے رفتارِ دوراں آجتک

آ اِدھر آ زندگی لے لے مجھے آغوش میں
تیری گرمی پر تصدق ہیں دل و جاں آج تک

عقلِ کل بننے سے باز آیا کرم کر اے دماغ
پہلے تھا پروینر انساں اور ہے انساں آج تک

۱۹۳۸ء
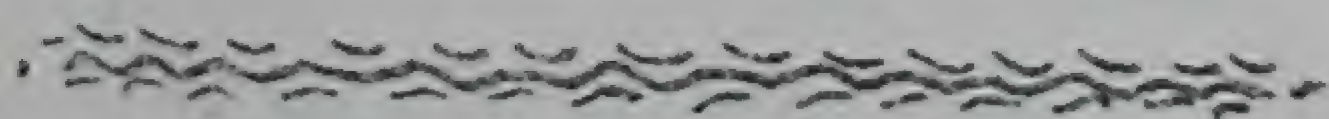
غزل

جنوں کو ہے خرد کی سرکشی کا امتحاں کرنا
ذرا برہم تو اپنی کاکل عنبر فشاں کرنا

ادب میری جبین شوق کا اے آستاں کرنا
مجھے آتا نہیں سجدوں کو اپنے رائیگاں کرنا

میں دل کو چاہتا تھا اس سے آگے پرفشاں کرنا
قیامت ہے ترا مجھکو اسیر دو جہاں کرنا

فریب آستان دوست کیا دینگے مہ و انجم
جبیں تو جانتی ہے اس کو سجدہ ہے کہاں کرنا

نقابِ ناز کو قیدِ قفس سمجھا ہے ظالم نے
محبت چاہتی ہے حُسن کو بھی پرفشاں کرنا

قفس میں آ چلی ہے ناز کی صبحِ گلستاں کی
ذرا اے نو اسیرو! پھر تو فکرِ آشیاں کرنا

ہجومِ لالہ و گل سے نظر ٹکرائی جاتی ہے
بہت مشکل ہے اب پاسِ نظامِ گلستاں کرنا

بہارِ گل کے رہنے رہتے کچھ تو سیکھ لے بلبل!
تجھی کو پھر پڑے گا انتظامِ گلستاں کرنا

ق

نظر محفل کی لپٹی ہے نقابِ فکرِ شاعر سے
بہت مشکل ہے اب شعروں میں جلووں کو نہاں کرنا

ورائے گوش و لب ہے ہر سخن حُسن و محبت کا
ہے بے حاصل غزل سنجی کو پابندِ زباں کرنا

تم اپنی ہر ادا سے داد دے سکتی ہو شعروں کی
مجھے آتا ہے اپنی ہر نظر کو گل فشاں کرنا

نظر تک حد ہے عرض شوخیٔ افکارِ شاعر کی
مجھے بھاتا نہیں دل کا زباں کو رازداں کرنا

نقابِ شعر میں پیرایۂ رنگیں ہلکی سی جنبش ہے
کہیں رسوا نہ انکو انجمن میں میری جاں کرنا

سنہ ۳۹ء

انتظار

وہ پہلے پانچ بجے شام سے، نہ آئیں گی
ابھی تو رات کے دس ہی بجے ہیں کیا کیجئے
یہ رینگتے ہوئے سے انتظار کے لمحے
عجیب سست قدم قافلے ہیں کیا کیجئے

یہ تیرگی کا بسیرا، یہ آندھیوں کا ہجوم
یہ ابر و باد کے حاکم کا ہولناک جلوس
نقاب ابر میں منہ کو چھپائے ماہ و نجوم
سیاہ خانۂ فطرت میں روشنی محبوس

دل و دماغ پہ چھایا ہوا، دھندلکا سا
یہ حال ہے کہ سحر کی بھی مجھ کو آس نہیں
ہزاروں راتوں سے چھائے ہوئے اندھیرے میں

نظر کی روشنی بھی اب نظر کے پاس نہیں

ابھی تو دیر بہت ہے بہت ہی دیر ابھی
ہجوم شوق میں دل کھو گیا تو کیا ہوگا؟
میں جانتا ہوں کہ منزل قریب ہے لیکن
یہیں پہ ختم سفر ہو گیا تو کیا ہوگا؟

وہ سر اپا اندھیرا، وہ بجلیاں چمکیں
مگر ابھی تو ورودِ سحر ہی میں ہے دیر
سنبھل سنبھل کے چلے قافلہ امیدوں کا
کہ انتظار کے رستے میں ہیں ہزاروں پھیر

یہ چند گھنٹے یہ سحر دم زندگی گھنٹے
نہ جانے کیوں بسر کرتے آج کر نہیں سکتے
نہ جانے وقت کو کہتے ہیں تیز رو کیوں کر
جب انتظار کے لمحے گزر نہیں سکتے

نہ جانے وقت کے کیوں تھر تھرا رہے ہیں قدم

گھڑی کی سوئیاں بھی آج سہمی جاتی ہیں
یہ انتظار کی ٹھہرائی مضمحل گھڑیاں
بُری طرح سے مجھے گھور کر ڈراتی ہیں

مگر میں ڈر نہیں سکتا، میں ڈر نہیں سکتا
کہ میری روح کو بے خوف کر گئی ہیں وہ
نگاہِ لطف سے میرے اندھیرے سینے میں
ہزاروں صبحوں کے انوار بھر گئی ہیں وہ

بنا لوں کیوں نہ کوئی مشترک نظامِ حیات
مرے ہی دل کی طرح وہ بھی اہلِ ہمت ہیں
سجا لوں کیوں نہ محل زندگی کا خوابوں سے
یہ انتظار کے لمحے بہت غنیمت ہیں

حسین جسم کی گرمی ہے یا مرے دل میں جذب
کروں نہ کیوں میں کوئی آفتابِ نو پیدا
بدل کے مسلک و آئینِ انقلابِ کہن

کروں نہ کیوں میں کوئی انقلاب تو پیدا!

جو دل کو چھیڑتی ہے یاد اُن کی زُلفوں کی
تو کیوں نہ پرچم ہمت ہوا میں لہراؤں
جو ان کے چہرے نے بخشی ہے چشمِ شوق کو آگ
اسے میں خرمنِ باطل پہ کیوں نہ برساؤں

ابھی تو وقت بہت ہے میں سوچ لوں کچھ اور
کہ کس طرح روشِ دہر کو بدلنا ہے۔
میں کر لوں غور نشیب فراز راہ پہ بھی
کہ اُن کو اور مجھے اب سے ساتھ چلنا ہے

ابھی سے کھینچ لوں کیوں میں راہ کا نقشہ
کہ پیچ و خم میں بہت راستے ہیں عشوہ طراز
ابھی سے زادِ سفر کا کچھ انتظام کروں
سفر ہے سخت بہت راہِ انقلاب دراز

ضرور آئینگی وہ حسبِ وعدہ پانچ بجے

میں اُن کو فیصلۂ آرزو سُنا دوں گا

بڑھے گا تیزی سے پھر کاروانِ رازِ نیاز

پلٹ پلٹ کے زمانے کو میں صدا دوں گا

غزل
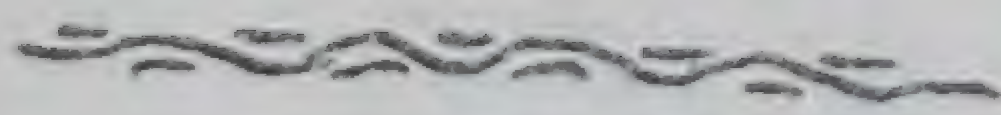
رسوائے گریہ کیوں کروں دردِ جگر کو میں
دامن سے ہوں چھپائے ہوئے چشمِ تر کو میں

ہے شوقِ خود فریب سے جلووں کی دلکشی
چاہوں تو اب بھی موڑ لوں اپنی نظر کو میں

اے شوقِ نارسا! مجھے منزل نہ ہو نصیب
سمجھا ہوں لطفِ شروعِ سفر کو میں

ملتا ہے راہِ شوق میں اک اک قدم پہ موڑ
کوئی مجھے بتائے کہ جاؤں کدھر کو میں

گردن لچک رہی ہے بلندی کے بوجھ سے
کب سجدہ کر رہا ہوں ترے سنگِ در کو میں

رکتی ہی اب نہیں مری پروازِ ناتمام
اے کاش پھینک دیتا کہیں بال و پر کو میں

پرشیزؔ! گمرہی میں ہوں غالبؔ کا ہم سفر
"پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

سنہ ۳۸ء

غزل

ترا پردہ کھلتا ہے مری آہِ نارسا سے
کبھی اٹھ گیا ہوا سے کبھی گر گیا ہوا سے

مری زندگی کی زینت ہوئی آفت و بلا سے
میں وہ زلفِ خم بہ خم ہوں جو سنور گئی ہوا سے

دیئے گمرہی نے مجھکو سبقِ خود اعتمادی
میں پہنچ گیا ہوں منزل پہ بچھڑ کے رہنما سے

مجھے معتبر سمجھتا تو چلا ہی لیتا کشتی
میرے زورِ دست و بازو کو گلا ہے ناخدا سے

یہ سکوتِ شب بلا ہے کہ سکوں میں بجھ رہا ہے
وہ چراغ میرے دل کا جو لڑا کیا ہوا سے

میں نکل گیا خفا آگے جو مٹر آلود دیکھتا ہوں

کہ اُبھر رہی ہے منزل مرے نقش ہائے پا سے

یہ کرشمۂ جنوں ہے کہ وفا پہ مٹ رہا ہوں
مری عقل تو لرزتی تھی تصورِ وفا سے

نہ سہی کلامِ شیریں یہ بھی کم نہیں ہے پرویز
کہ مٹھاس ہے دلوں میں مری تلخیٔ نوا سے

سنہ ۳۹ء

کھیل اب بند کرو

فکرِ شاعر کی لطافت سے بہت کھیل چکیں
جذبۂ دل کی نزاکت سے بہت کھیل چکیں
شوقِ بے تاب کی فطرت سے بہت کھیل چکیں
میرے احساس کی شدّت سے بہت کھیل چکیں

دیکھو تم میری محبت سے بہت کھیل چکیں
کھیل اب بند کرو!

چھیڑ کر سازِ خیالات کے نازک سے تار
تم نے پھینکے مرے خوابوں سے کبھی نغموں کے شرار
گر پڑی پاؤں پہ جذبات کے عقلِ خود دار
کر گئے تم ذہن کو کبھی دامِ تمنّا کا شکار

میرے افکار کی قدرت سے بہت کھیل چکیں

کھیل اب بند کرو!

ایک ذرّہ سی عنایت کی ضرورت کیا تھی؟
ایسے پیمانِ رفاقت کی ضرورت کیا تھی؟
اتنی مجبورِ محبّت کی ضرورت کیا تھی؟
غم ہی اچھا تھا، مسرّت کی ضرورت کیا تھی؟
تم مرے خوابِ مسرّت سے بہت کھیل چکیں
کھیل اب بند کرو!

ہنس بھی دیتا ہے کبھی کھیل یہ موجودہ نظام
لے بھی لیتا ہے کبھی ہلکے سے نشتر سے کام
آگے بڑھتا ہے مگر اسکی شریعت میں حرام
کھیل ہی کھیل میں پھیلا کے محبّت کا دام
تم مرے جذبۂ وحشت سے بہت کھیل چکیں
کھیل اب بند کرو!

سیم و زر کے لئے بیہودہ قدامت معبود

کورئ دیدہ و دل، دیر و حرم کا مقصود
زندگی پہ ابھی خوشی کی ابھی راہیں مسدود
تم بھی موجودہ تمدّن کو سمجھ کر مسجود

دِل کافر کی عبادت سے بہت کھیل چکیں
کھیل اب بند کرو!

ایک شیدائے طرب، صاحبِ دولت کی طرح
ایک محرومِ نظر، خوگرِ لذّت کی طرح
ایک ناواقفِ آئینِ حکومت کی طرح
ایک نافہم سے والئ ریاست کی طرح

تم مرے اشکوں کی دولت سے بہت کھیل چکیں
کھیل اب بند کرو!

ایسے کھیلوں کی زمانے کو ضرورت ہی نہیں
زندگی جس سے نہ جھلکے وہ محبّت ہی نہیں

۴۳ء

غزل

ماتم تھا مرگِ دل کا، فدا جان نہ کر سکے

خدمت تری ہم اے غمِ جاناں نہ کر سکے

اے شوقِ نارسا! تیری آشفتگی فضول

جب ان کے گیسوؤں کو پریشاں نہ کر سکے

اللہ ری پردہ داریٔ ناموسِ حُسنِ دوست

ہم اپنے دل کے داغ نمایاں نہ کر سکے

چبھتی ہیں میرے دل میں یہ نشتر سی جھکی جھکی

کردہ ستم جو تجھ کو پشیماں نہ کر سکے

تیرے خرامِ ناز کی آہستہ وار تھی

ہم کچھ علاجِ گردشِ دوراں نہ کر سکے

اب تک ہے دل میں باقی لہو کی اک آدھ بوند

ہم حسبِ شوق دعوتِ مژگاں نہ کر سکے

آباد کر رہا ہوں وہ دنیا خیال میں

چاہے اگر تو خود بھی تو ویراں نہ کر سکے

جو جلوہ بھی ملا وہ نظر آشنا ملا

وہ میری چشمِ شوق کو حیراں نہ کر سکے

پرویزؔ ان کی بزم میں شاعر نہیں ہے وہ

جو اپنی ہر نظر کو غزل خواں نہ کر سکے

۱۹۴۱ء

آخری ملاقات

آج یہ آخری ہے تم سے ملاقات میری
کل بہت دُور، بہت دُور چلا جاؤں گا
جس پہ رکھا نہ کبھی تم نے بھی کوئی پھاپا
دل میں لیکر میں وہ ناسور چلا جاؤں گا

کل سے ہونا ہے سفر میری تباہی کا شروع
یہ بھی اچھا ہی کیا ہٹ جو گئیں راہ سے تم
راہ میں مجھ میری قسمت کے اندھیرے رقصاں
تم بھی کیوں ہوتیں میرے ساتھ اندھیروں میں گم

تم نے جب کر ہی دیا ہمسفری سے انکار
پھر نہ کیوں ایک نئی راہ پہ چل کر دیکھوں

گود میں غار ہی کی جب مجھے لینی ہے پناہ
کیوں نہ اک اونچی پہاڑی سے پھسل کر دیکھوں

راستے پر میں تنہا ہی کے چلوں گا تنہا
تم کو بھی شہر کے میں آواز نہیں دے سکتا
جگمگاتے ہوئے اشعار، امیدوں کے چراغ
ان چراغوں کو بھی میں ساتھ نہیں لے سکتا

آج یہ آخری ہے تم سے ملاقات میری
اور اک بار میں آغوش میں تم کو لے لوں
کل ہوا آگ بجھا دے گی مرے سینے کی
دامنِ وقت کو کچھ آج تو شعلے دے دوں

تم تو کہتی تھیں "نہیں مجھکو محبت تم سے"
پھر سبب کیا ہے جو میرے لئے ناشاد ہو تم
آج آغوشِ محبت میں گرفتار رہو
کل سے آزاد ہو، آزاد ہو، آزاد ہو تم

کل سے آزاد ہو، آزاد ہو، بالکل آزاد
رحم کی بھیک نہ اب مانگیں گی آہیں میری
تارِ اشکوں کا مرے اب نہ بنے گا زنجیر
اب نہ دیکھو گی یہ مایوس نگاہیں میری

کل سے آزاد ہو، آزاد ہو، نکہت کی طرح
سینۂ غنچہ کا زنداں نہ رہے گا باقی
کھیلنا کھیلتی رہنا گل و ریحاں سے تم
مجھ سا کل ننگِ گلستاں نہ رہے گا باقی

مسکراتی نہیں کیوں تم کہ ہو کل سے آزاد
تم کو دکھ دیگی نہ اب میری پریشاں حالی
روشِ زیست پہ ہنستی ہوئی اب رقص کرو
پاؤں پکڑے گی نہ اٹھ اٹھ کے مری پامالی

یاد میری جو سسکتی ہے تمہارے دل میں
پیس ڈالیں گے گزرتے ہوئے لمحے اس کو

چھیڑ دیتا تھا کبھی ذہن کو جو میرا خیال
وقت چھوڑے گا نہ اب پاس تمہارے اس کو

کل سے آزاد ہوا اپنی ہی نگاہوں کی طرح
بھیڑ یاں اب پہنائے گی مروّت تم کو
اب ہمدردی ہیہم یہ کرے گی مجبور
دم بہ دم میری بگڑتی ہوئی حالت تم کو

تم بھی رونے لگیں اور نہ بھی محبّت کے بغیر
رحم کی آنکھوں میں آجاتے ہیں آنسو بھی کبھی
دل ہی رکھنے کے لئے کیوں نہ ہو بدبختوں کا
نگہ ناز بدل لیتی ہے پہلو بھی کبھی

جب تمہارے لئے ممکن ہی نہیں ہم سفری
رہ گئی کیجئے تم کیوں ساتھ چلتے چلتے
زندگی میری اُلجھتی ہی چلی جائے گی
رحم کے ہاتھ ہی کیا آئے گی سلجھانے میں

آج افسردہ ہو کیوں تم کہ ہو کل سے آزاد
دیکھتیں کیوں نہیں مستقبلِ روشن اپنا؟
تم کو تو ہنسنا ہے اور ہنستے ہی رہنا ہے مدام
کیوں بھگوتی ہو عبث اشکوں سے دامن اپنا

ہو چکی دیر بہت، جاؤ، چلی جاؤ، مگر
میرے سوکھے ہوئے ہونٹوں کی دعائیں لے لو
آخری ہچکی بھی آ ہی گئی میرے دل کو
آخری بار نگاہوں سے بلائیں لے لو

۱۹۴۳ء

غزل

نظر کو بے نیازِ کیفِ ساغر کر لیا میں نے
تم آنکھیں پھیر لو اب جبر دِل پر کر لیا میں نے

تمہارا سنگِ در چھوٹا، تو چھوٹے چھوٹنا ہی تھا
چلو اچھا ہوا، اب دِل کو پتھر کر لیا میں نے

تبسم کو ذرا سمجھائیے، چھیڑے نہ یوں دِل کو
تمنا کو سلام، اے بندہ پرور! کر لیا میں نے

وفورِ تشنگی میں جو مری آنکھوں سے ٹپکی تھیں
انہی بوندوں سے ہونٹوں کو مہماں نہ کر لیا میں نے

نظر کو رہ گئے چھیڑے شہابِ زخمِ محبت کو
کہ اپنے ہر نفس کو آج نشتر کر لیا میں نے

بہت سے معرکوں سے مسکراتی زندگی گزری
ترا ہی غم قیامت تھا، مگر سر کر لیا میں نے

نہیں ہوتی کہیں پرویز عزت دادخواہوں کی
یہیں سے کچھ قیاسِ روزِ محشر کر لیا میں نے

سنہ ۴۰ء
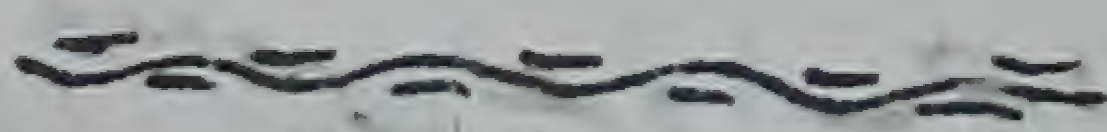
گلچیں

بلبل و گل سے غرض تھی نہ گلستاں سے کام
تم کو تو پیاس بجھانی تھی خود آرائی کی
اوس کی بوندوں میں کس کس کے تھے آنسو پنہاں
کتنے دل سوتے تھے آغوش میں رعنائی کی
کتنی امیدیں سسکتی تھیں حجابِ گل میں
آرزو کتنی امنگوں کو تھی انگڑائی کی
حُسن خود بیں نے تمہیں سیر کی فرصت ہی نہ دی
دل گلشن میں اترنے کی اجازت ہی نہ دی
باغ میں شاخوں سے کچھ پھول تو توڑے تم نے
انگلیاں نبض مگر انکی نہ پہچان سکیں

دیکھ کر پتوں کو ہونٹوں پہ ہنسی تو آئی
انکے سینوں میں چھپے راز نہ تم جان سکیں
وقت کی دھوپ سے پھولوں کو بچانے کے لئے
سچی ہمدردی کا آنچل نہ کبھی تان سکیں

کتنے ہی لالہ و گل دھوپ میں کمھلائینگے
شبنمی رات کے آنسو انھیں یاد آئینگے

ہاں میں اب سمجھا ضرورت تھی تمہیں ہار کی صرف
اور وہ بھی نظر افروزی گردن کے لئے
پھول چننے پڑے بس تم کو اسی مقصد سے
ورنہ کچھ دل تو نہ تڑپا تھا گلشن کے لئے
جانتا ہوں کہ چبھے ہونگے کئی کانٹے بھی
ہاتھ مجروح بھی ہو جاتا ہے دامن کے لئے

انگلیوں سے جو لہو تھوڑا سا بہہ جاتا ہے
کچھ نہ کچھ پھولوں کا افسانہ بھی کہہ جاتا ہے

نت نئے رنگ کے ہیں پھول بھرے دامن میں
اِن کو ترتیب سے دھاگے میں سجاتی جاؤ
چھیدتی جاؤ غریبوں کے دکھی سینوں کو
ساتھ ہی ساختہ ادائیں بھی دکھاتی جاؤ
اتنی خاموشیِ بے کیف سے کیا حاصِل ہے
فتح مندانہ کوئی گیت بھی گاتی جاؤ

گوندھنا ہے جو تمھیں ہار تو تھکنا کیسا
دیکھ کر پھولوں کی کثرت کو جھجکنا کیسا

تُم نے بے سوچے ہوئے ہار یہ کیوں گوندھ لیا
اک وہ پھول جو کھلتا ہے ترنم بن کر
پھر میں کہتا ہوں کہ وہ پھول بھی کیوں گوندھ لیا
جس کی خاموشی بھی رہتی ہے تکلّم بن کر
رہ کے دھاگے میں بھی چھیڑا ہی کریگا تم کو
کبھی آنسو کبھی رنگین تبسّم بن کر

گنگناتا ہُوا یہ مجھول ستم ڈھائے گا
دِل ہے شاعر کا یہ گردن سے لپٹ جائیگا

ہار کب گوندھ چکو، ہے یہ بتانا مشکل
بس سمجھ لو کہ یہی کام ہے کرتے رہنا
نام تھکنے کا نہ لو جادۂ آرائش پر
تم کو اِس راہ سے ہے یونہی گزرتے رہنا
بہ زرو سیم کی بنیاد یہ استادہ نظام
چاہتا ہے ابھی کچھ اور سنورتے رہنا
حالِ گل پر نہ کرو غور چمن کی سوگند
ہار گوندھا کرو، تہذیبِ کہن کی سوگند

سنہ ۴۳ء

غزل

نقشِ قدم پہ میرے زمانہ رواں ہُوا
بھٹکا کبھی میں تو راہبر کارواں ہُوا

ناکامیوں سے شوق مرا کامراں ہُوا
مجھ پر ترا حجاب بہت مہرباں ہُوا

افشائے راز کا تجھے ہر دم گماں ہُوا
مجھ سے خطا ہوئی جو ترا رازداں ہُوا

میرے شباب شوق سے برسیں جوانیاں
جب میں جواں ہوا تو زمانہ جواں ہُوا

سجدوں سے کھیلتی رہی میری جبینِ شوق
ہر آستاں ہُوا، کبھی وہ آستاں ہُوا،

تمہیدِ التفات کی جھیلی ہیں سختیاں
دِل میرا کانپ اُٹھا جو کوئی مہرباں ہُوا

تولا نظر کے کانٹوں پہ جلووں کو آپ کے
میرے ہی دم سے حُسن کا پلّہ گراں ہوا

ہیں حُسنِ کائنات سیہ کاریاں مری
اِک اِک گُناہ خالِ رُخِ دو جہاں ہُوا

تلخیٔ زندگی ہی کا یہ فیض ہے کہ آج
ہر ذرّہ تیرا شاعرِ شیریں بیاں ہُوا

سنہ [illegible]

تجدیدِ سفر

ساتھ چل سکتے تھے دونوں شاہراہِ وقت پر
پہلی ہی منزل پہ تم مجھ سے جُدا کیوں ہو گئیں؟
یہ کھلونے تھے، کھلونے اہلِ ہمّت کے لئے
پیچ و خم سے راہ کے آخر خفا کیوں ہو گئیں؟
سختیوں کے سر کچل سکتا تھا ربطِ حسن و عشق
ساتھ چلتے چلتے تم نا آشنا کیوں ہو گئیں؟

مجھکو تو چلنا ہی ہے، اب خیر:
آگے بڑھتا جاؤں گا۔

میں نے سوچا تھا کہ وہ لوں جادۂ ایام پہ
گیت گاتے، رقص کرتے، مسکراتے جائیں گے

یہ بھی سوچا تھا کہ پیچھے آنے والوں کے لئے
ہر قدم پہ راہ میں، منزل چھپاتے جائیں گے

یہ بھی سوچا تھا کہ ہر کانٹے میں بھر کر رنگِ گل
خارزارِ دہر کو گلشن بناتے جائیں گے

راستے کی سختیاں کیا جانے کیا کیا کہہ گئیں
میں تڑپ کر رہ گیا اور تم ٹھٹک کر رہ گئیں

اس ٹھٹکنے سے تمہارے بجھ گئے رخسارِ حال
روئے مستقبل پہ ماضی کا اندھیرا چھا گیا

عقل کا کیا ذکر وہ تو یوں بھی کم ہمت ہی تھی
تھا جنوں بے باک وہ بھی دفعتاً گھبرا گیا

ولولوں کے خون کی گرمی بھی کم ہونے لگی
زندگی کے گرم ماتھے پر پسینہ آگیا

جلوہ ہائے صبحِ نو آنکھیں چرا کر رہ گئے
تیرگی کے سیل میں دل کے اجالے بہہ گئے

تم اچانک آگئیں پھر لے کے شمعِ التفات
میری افسردہ تمنّاؤں کو پھر گرما گئیں
دے گئیں پھر اترے چہرے کو امنگوں کی بہار
مسکرا کر زندگی پر تازگی برسا گئیں
ہر نفس سے پھر شمیمِ جانفزا چھننے لگی
چھا گئیں پھر ابرِ گلشن بن کے دل پر چھا گئیں

جذبۂ بیکار کو ہمت ہوا دینے لگی
پھر نظر کشتیٔ فضائے نور میں کھینے لگی

ظلمتیں سہمی ہوئی ہیں فق ہے رنگِ شامِ یاس
منہ چھپانا اب نہ حسنِ صبحِ نو کا واسطہ
کامیابی رُوپ پروانے کا بھرتی آئے گی
مضمحل ہونا نہ شمعِ رُخ کی لو کا واسطہ

لمحہ لمحہ اپنے سینے میں ہے اِک منزل لئے
رک نہ جانا دشت کی بے باک رو کا واسطہ

آؤ مِل کر روشنی کے گیت گاتے جائیں ہم
راہِ ظلمت میں مہ و انجم لُٹاتے جائیں ہم

آؤ بڑھ کر سینۂ ظلمت میں خنجر بھونک دیں
کاٹ دیں سر تیرگی کا نور کی تلوار سے
حادثوں کو روندڈالیں پیس دیں آلام کو
آب کر دیں زہرۂ غم نعرۂ پیکار سے
راہ زن بے کیفیوں سے اُن کی ہمت چھین لیں
ہر قدم پہ کام لیں ہم جراًتِ سرشار سے

عاشقوں کے انقلابی کارواں آنے کو ہیں
پیچھے پیچھے اور ہم سے نوجواں آنے کو ہیں

۱۹۵۲ء

غزل

رہو اِک وضع پر قائم، یہی ہے مدّعا میرا
جفا ہی میں سہی ہاں جھلکے تو کچھ رنگِ وفا میرا

نشاں کیا ڈھونڈتے ہیں شب روانِ ارتقا میرا
جبینِ ماہ پر اُبھرا ہوا ہے نقشِ پا میرا

ترے دامن کے کام آیا جنونِ نارسا میرا
گریبانِ سحر تک ہاتھ بڑھ کے رُک گیا میرا

یہ جلووں کا تلاطم یہ فضا کا بیکراں دریا
کہاں ہے اے جوانی دیکھنی جا ڈوبنا میرا

تصادم موج و طوفاں کا مبارک جوشِ دریا کو
کہاں سے بیچ میں یارب! سفینہ آگیا میرا

ہے کل کی بات میں ہی اخترِ تقدیرِ عالم تھا
ستارے رو رہے ہیں یاد کر کے ٹوٹنا میرا

کبھی گل کی خموشی ہے کبھی نالہ ہے بلبل کا
چمن میں روپ کیا کیا بھر رہا ہے مدعا میرا

میں ہوں ہمّت ترا اپنی پستیٔ پرواز پر نادم
بچا لینے پہ بھی پر عرش سے ٹکرا گیا میرا

۱۹۳ء

غزل

حسن کیوں عشق کی تصویر ہے، میں کیا جانوں
میرے شعروں میں جو تاثیر ہے میں کیا جانوں

میرے گلدستۂ اشعار میں رقصاں ہے بہار
کس کی یہ شوخیٔ تحریر ہے، میں کیا جانوں

زندگی اپنی اسیری پہ مٹی جاتی ہے
کس کی ڈالی ہوئی زنجیر ہے، میں کیا جانوں

آپ کو خواب میں دیکھا تھا لٹاتے ہوئے پھول
کیا میرے خواب کی تعبیر ہے، میں کیا جانوں

دیکھتا یہ ہوں کہ رک جاتی ہے بڑھ بڑھ کے نگاہ
شوق کا کون عناں گیر ہے، میں کیا جانوں

مصلحت ہی کوئی ہوگی، یہ سمجھ لیتا ہوں

کیوں قریب آنے میں تاخیر ہے میں کیا جانوں
زندگی آج شفق رنگ نظر آتی ہے
کس کی کھینچی ہوئی تصویر ہے میں کیا جانوں

سنہ ۲۵ء

رباعیات

مستی میں نظم چمک رہی ہے ساقی
ساری محفل مہک رہی ہے ساقی
کیا کیف رباعیوں میں بھر لایا ہوں
ہر لفظ سے مے چھلک رہی ہے ساقی

پھوٹا ہے شکستہ پیالۂ پارسائی ساقی
اس پیتے زلف کسی کی دلربائی ساقی
دختر رز ری ہے جسے کیسے ہی لوٹ
ساقی ساقی تری دہائی ساقی

پیاسی ہے شراب کی خدائی ساقی
پیاری ہے جام ور دلربائی ساقی
لے سر ہے ساتھ کا سہارا لیے
تکیے پہ تری کلائی ساقی

کیا رنگ زمین و آسماں ہے ساقی
اترا ہوا چہرۂ جہاں ہے ساقی
لو دینے لگیں شفق سے عارض جس سے
وہ بہتی ہوئی آگ کہاں ہے ساقی

ہمت ہے فلک کا پھوڑ دوں گا ساقی
پیمانۂ ماہ توڑ دوں گا ابھی
جوں رشتۂ تاک ہیں سبھی گرہ انجم لیے
تاروں کو ابھی نچوڑ دوں گا ساقی

آبادیاں ہیں جلوۂ شراب آنکھوں میں
ضو باریاں ہیں صبح کا شباب آنکھوں میں
ہیں بادۂ شبگیر کی بوندیں ہیں کہ آفت
رقصاں ہیں یا ہزاروں آفتاب آنکھوں میں

جھلکی جھلکی بہار گلزاروں کی
لپکی لپکی نگاہ میخواروں کی
ساقی ساقی نشۂ مے سے ہشیار
جھلکی جھلکی شراب رخساروں کی